Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1969

ہماری آزادی اور غلامی کا معیار

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت
صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام
میں سلطانی یا بادشاہوں کی اطاعت سے بیزاری بیان کی۔ کسی فرد، شخص یا ادارہ کی قرآن مجید
کے احکام کی اساس ہے۔ معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔
اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کیلئے آپ کو
بااختیار ادارہ مملکت کی ضرورت ہے۔ (قائداعظم محمد علی جناح)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

بدل اشتراک
سالانہ ـــــ پاکستان ـــــ دس روپے
سالانہ ـــــ ہندوستان ـــــ پندرہ روپے
سالانہ ـــــ غیر ممالک ـــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاکستان ۔ ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ لاہور

جلد (۲۲) | اگست ۱۹۶۹ء | نمبر (۸)

فہرست

(۱) لمعات ـــــ ۲
(۲) طلوعِ اسلام کالج ـــــ (شیخ سراج الحق، سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ـــــ ۱۸
(۳) جماعتِ اسلامی کے ذیلی ادارے ـــــ (شاہد عادل) ـــــ ۲۵
(۴) امریکہ کے خلا نوردوں کو سلام ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۴۰
(۵) کفر کے فتوے ـــــ ۴۱
(۶) اپنے بزرگوں کی باتیں سنیئے ـــــ ۶۴
(۷) استعمار کا عالمی کردار ـــــ (محترم خورشید عالم صاحب) ـــــ ۷۳

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تعلیمی پالیسی (جدید)

"جس قسم کی آج کے نوجوانوں کی تعلیم، اسی قسم کی کل کی قوم"

یہ وہ اساسی حقیقت ہے جسے جتنی بار بھی دہرایا جائے کم ہے — اور ایک زیرِ تعمیر قوم کے لئے تو اسے وظیفہ (ورد) کے طور پر دہرانا چاہیئے — یہی وجہ ہے کہ ہم اس حقیقت کو گذشتہ بیس بائیس سال سے مسلسل اور التزاماً اصراراً اور تکراراً دہراتے چلے آرہے ہیں۔ ہم نے اس اصول کو دہرایا ہی نہیں، اس کی طرف اربابِ بست وکشاد کی توجہ بار بار منعطف کرائی۔ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص کو ایک ایک کرکے نمایاں کیا اور جس قسم کی تعلیم کی ہمیں ضرورت ہے، اس کے بنیادی خط وخال کو متعدد بار پیش کیا۔ لیکن قوم پر کچھ ایسا نفسا نفسی کا عالم طاری تھا کہ کسی نے اس بنیادی حقیقت کی طرف توجہ نہ دی۔ نتیجہ اس کا وہ عبرت انگیز انتشار ہے جس میں ہماری قوم اس وقت گرفتار ہے۔

مارشل لاء کے متعلق عام تصور یہ ہے کہ اس کی مثال فائر بریگیڈ کی سی ہوتی ہے۔ جب کسی مکان کو آگ گھیر لیتی ہے تو وہ خطرے کی گھنٹی بجاتا، برق رفتاری سے آجاتا ہے۔ پوری مستعدی سے آگ بجھاتا ہے اور اس کے بعد پھر اپنے مستقر کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ لیکن موجودہ مارشل لاء نے اپنا فریضہ آگ بجھانے تک ہی محدود نہیں رکھا۔ اس نے آگ بجھانے کے بعد یہ دیکھنا بھی شروع کیا ہے کہ اس مکان کو آگ لگی کیسے اور وہ کون سی تدابیر ہیں جنہیں اختیار کرنے کے بعد اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ دوبارہ آگ نہیں لگے گی۔ چنانچہ جب انہوں نے اس تباہ حالی کا جائزہ لیا تو وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے کہ نوجوانوں کی اس پریشاں نظری کا بنیادی سبب، اور ملک میں تشتت وانتشار کی اولین وجہ یہاں کا غلط نظامِ تعلیم ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس مسئلہ کو اپنی خصوصی

توجہ کا مستحق قرار دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں' ایک جامع تعلیمی پالیسی کا اعلان کر دیا۔ یہ پالیسی مختلف اخبارات میں شائع ہوئی ہے اور ہمارے پیشِ نظر اس کا وہ متن ہے جو پاکستان ٹائمز کی ۷ر جولائی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ مارشل لاء کے حکام نے بکمال دانش اطواری و دور اندیشی' اس پالیسی کے متعلق' ملک کے ارباب فکر و نظر کو اپنی آراء پیش کرنے کی دعوت دی ہے۔ ان کی یہی دعوت' ہماری ان معروضات کی محرک ہے۔

اس پالیسی کو اصولی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ــــ ایک حصہ کا تعلق' مرض کی تشخیص سے ہے اور دوسرے کا اس کے علاج سے۔ پھر علاج سے متعلق حصہ کو بھی دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شق میں نسخہ تجویز کیا گیا ہے اور دوسرے میں اس کی ترکیب استعمال۔ بالفاظ دیگر' ایک شق کا تعلق نظامِ تعلیم سے ہے اور دوسرے کا اس کے انتظام سے۔ ہم اپنی نگارشات کو زیادہ تر تشخیص اور نسخہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ انتظامی شعبہ سے بحث کرنا ایسا ضروری نہیں سمجھتے۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تشخیص کے سلسلہ میں' معالج نے جس رگ پر ہاتھ رکھا ہے وہی سب سے زیادہ دکھتی ہوئی رگ ہے، وہی علتِ مرض ہے، وہی بنیادی خرابی ہے۔ نظامِ تعلیم ہی کی خرابی نہیں' ہمارے تمدن و معاشرت کی خرابی۔ سیاست و معیشت کی خرابی۔ نظریہ و عمل کی خرابی۔ زندگی کے ہر گوشے کی خرابی۔ بلکہ یوں کہیے کہ دنیا اور آخرت دونوں کی خرابی ــــ وذالک ھو الخسران المبین ــــ یہ سب سے بڑی اور نمایاں خرابی ہے ــــ وہ خرابی ہے' دین اور دنیا کی ثنویت (DUALITY)۔ یعنی مذہب اور دنیاوی امور کی دو الگ الگ دائروں میں تقسیم۔ اسی کو' عصرِ حاضر کی اصطلاح میں' سیکولر (SECULAR) اور مذہبی (RELIGIOUS) کی تفریق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس تفریق کو شرک قرار دیا تھا جب کہا تھا کہ تم "ارض میں اپنے لئے اور خدا چاہتے ہو اللہ سماء میں اور خدا"۔ قرآن' انسانی زندگی کو من حیث الکل لیتا ہے' اسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ وہ "قیصر کا حصہ الگ اور خدا کا الگ" تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ثنویت کے اس باطل عقیدہ کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا نظام عطا کیا' اور محمد رسول اللہ والذین معہ نے اس نظام کو اس طرح عملاً متشکل کیا کہ یہ ثنویت حرفِ باطل کی طرح مٹ گئی۔ لیکن اس کے بعد ہم نے پھر سے اسی ثنویت کو اپنا لیا اور اس طرح ہماری زندگی کا ہر شعبہ مستقل طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ یورپ (یعنی عیسائیت) نے بھی اپنے ہاں یہی کیا تھا۔ یعنی انہوں نے بھی مذہب کو گرجا کی چار دیواری تک محدود کر دیا اور دنیاوی معاملات اپنے طور پر طے کرنے لگے۔ لیکن ان میں اور ہم میں ایک بنیادی فرق رہا۔ انہوں نے اس ثنویت کو اختیار کیا تو کھلے بندوں اختیار کیا' اور دھڑلے سے ہر جگہ اس کا

اعلان کیا۔ لیکن ہم نے عملاً اختیار تو اسی تفریق کو کیا لیکن زبان سے یہ دہراتے رہے کہ اسلام میں مذہب و سیاست میں کوئی تفریق، اور دین اور دنیا میں کسی قسم کی تمیز نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہم میں ثنویت کے ساتھ منافقت بھی درآئی۔ اور اس کا نتیجہ یہ کہ ہم، دین اور دنیا کی وحدت کی ابدی برکات سے تو محروم ہوئے ہی تھے، ثنویت کے ان عارضی سے فوائد سے بھی تہی دامن رہے جس سے یورپ متمتع ہوا۔ یہی ثنویت (اور منافقت) ہمارے نظامِ تعلیم کے رگ و پے میں سرایت کئے چلی آرہی ہے جس کا عملی نتیجہ، ایک طرف وہ مکاتب اور دارالعلوم ہیں جو مذہبی تعلیم دینے کے مدعی ہیں اور دوسری طرف وہ سکول اور کالج جن میں دنیاوی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تو رہی ثنویت۔ اور منافقت (یا کم از کم خود فریبی) یہ کہ کبھی سکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کے پیریڈ (یا مضمون) کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور کبھی کسی دارالعلوم کی سند کو یونیورسٹی کی ڈگری کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح سمجھ لیا (یا عوام کو باور کرا دیا) جاتا ہے کہ ہم نے دین و دنیا کی اسلام سوز تفریق کی خلیج کو پاٹ دیا ہے۔

زیرِ نظر تعلیمی پالیسی کے پہلے ہی باب (بلکہ تمہیدی تعارف) میں اس بنیادی خرابی کو بڑے نمایاں انداز سے سامنے لایا گیا ہے جس کے لئے ہم اس پالیسی کے مرتبین کو درخورِ تحسین و تبریک سمجھتے ہیں۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ

> پاکستان میں اس وقت، دو الگ الگ نظامِ تعلیم شانہ بشانہ چل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کو جدید نظام اور دوسرے کو قدیم نظام کہہ لیجئے۔ جدید نظام کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں ہوئی اور انگریزوں کے سامراج میں یہ پروان چڑھا۔ اس کا مقصد ایسے انسانوں کی جماعت کی تخلیق تھا جن کی چمڑی اور خون کا رنگ تو کالا ہو لیکن جن کے خیالات، نظریات، ذوق اور فکر، حتیٰ کہ اخلاقیات تک انگریزی ہوں۔ .... یہ نظام کسی طرح بھی ہمارے لئے موزوں قرار نہیں پا سکتا۔
>
> دوسرا نظام (یعنی قدیم نظام) جو عربی زبان کی تعلیم پر زور دیتا ہے، اور جسے معاشی یا ٹیکنالوجی کے شعبوں سے کوئی تعلق نہیں، برسہا برس سے جامد چلا آ رہا ہے۔
>
> اس سے واضح ہے کہ ان ہر دو نظامہائے تعلیم میں سے کوئی بھی اطمینان بخش نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان دونوں نظاموں کو بدل کر ان کی جگہ ایک ایسا نظام رائج کیا جائے جو پاکستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تقاضوں سے زیادہ

ہم آہنگ ہو۔

اس کے بعد اس پالیسی میں موجودہ ثنویت کی خرابیوں پر تفصیلی بحث کے سلسلہ میں موجودہ تعلیمی پالیسیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ان پالیسیوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ ان دیواروں کو اور زیادہ مستحکم کریں جو حد فاصل کا کام دیتی ہیں

(۱) اس طبقہ میں جو مذہبی تعلیم حاصل کرتا ہے اور اس میں جو سیکولر تعلیم حاصل کرتا ہے۔

(۲) ان میں جو اپنی روزمرہ کی زندگی میں انگریزی زبان کو ذریعہ اظہار بناتے ہیں اور ان میں جو ایسا نہیں کرتے۔ اور

(۳) ان میں جو مرفہ الحال گھرانوں میں جنم لیتے ہیں اور جو غریبوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ

یہ صورت حالات بڑی خطرناک ہے اور اگر اسے بدستور جاری رہنے دیا گیا تو اس کے نتائج بڑے ناخوشگوار ہوں گے۔ بنابریں ہماری تعلیمی پالیسی کا بنیادی ستون ایک وحدانی نظام تعلیم کی تشکیل ہونا چاہیئے۔

آپ غور فرمایئے کہ مرض کی یہ تشخیص کسقدر حاذقانہ ہے اور اس پالیسی کے مرتبین کی نگاہ کس طرح ٹھیک نقطہ پر جا کر ٹکی ہے۔ انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کی جگہ ایک وحدانی نظام کی ترویج کارِ طفلاں نہیں ہے۔ ان کے الفاظ ہیں

اس کے لئے بڑے انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جہاں تک مرض کی تشخیص اور علاج کے لئے نسخہ کی تجویز کا تعلق ہے، یہ پالیسی کسقدر امید زا اور حوصلہ افزا ہے۔ لیکن جب ہم اس کی عملی سفارشات پر پہنچتے ہیں تو ہماری حالت اس طاؤس کی سی ہو جاتی ہے جو دفعتہً نشاط سے مستانہ وار رقص کرتا ہے لیکن جب اس کی نگاہیں اپنے پاؤں پر پڑتی ہیں تو بصد حسرت و یاس اپنے پر سمیٹ کر چپ چاپ ایک طرف کو ہو لیتا ہے۔ اس پالیسی میں اس مرض کا عملی علاج یہ بتایا گیا ہے کہ

یہ وحدانی نظام تعلیم اسلامی ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دسویں جماعت تک،

اسلامیات کو لازمی مضمون قرار دے دیا جائے اور اس کے بعد اختیاری۔

یعنی ـــــ جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اسے علیٰ حالہ جاری رکھا جائے ـــ زیادہ سے زیادہ یہ کہ یونیورسٹی کی سطح پر اسلامک ریسرچ پر زیادہ زور دیا جائے ۔۔۔۔۔۔ اور جو طالب العلم عام مضامین میں بی۔اے یا ایم۔اے یا ڈاکٹریٹ کریں، ان میں اور جو اسلامیات یا دوسرے مذہبی مضامین میں ایسا کریں، ان میں، سرکاری ملازمتوں میں داخلہ کے سلسلہ میں کسی قسم کی تفریق نہ کی جائے۔

آپ غور فرمایئے کہ جو مرتبین ابھی ابھی یہ فرما رہے تھے کہ موجودہ نظامہائے تعلیم کی جگہ وحدانی نظام (یعنی ایسا نظام جس میں دینی اور سیکولر تعلیم ایک دوسرے میں اس طرح مدغم کر دی جائے کہ ان میں کہیں کوئی تفریق نظر نہ آئے) کے قیام کے لئے بڑے انقلابی اقدامات کی ضرورت ہوگی، وہ جب عملی اقدامات کی طرف آتے ہیں تو موجودہ نظاموں میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی ہی نہیں کرنا چاہتے اور اسلامیات کا جو مضمون اس وقت مدرسوں اور کالجوں میں رائج ہے اسے علیٰ حالہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اور اس طرح سمجھتے ہیں کہ ثنویت کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس کے متعلق ہم اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتے ہیں کہ

مدت کے بعد اذنِ تبسم ملا ہمیں
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

ہم جانتے ہیں کہ موجودہ ثنویت کو مٹا کر اس کی جگہ وحدانی نظامِ تعلیم رائج کرنے کے لئے (جیسا کہ مرتبین پالیسی نے خود ہی فرمایا ہے) "بڑے انقلابی اقدامات" کی ضرورت ہوگی ـــــ اور اس کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی ـــــ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایسی تبدیلی، ایک دن میں نہیں کی جا سکتی۔ یہ بتدریج عمل میں لائی جا سکیگی۔ لیکن اس پالیسی کے جن مرتبین نے اس کا اس شدت سے احساس کیا تھا، ان سے ہماری یہ توقع بے جا نہیں تھی کہ وہ کم از کم اس تبدیلی کے لئے ایسا لائحہ عمل (پروگرام) تجویز فرما دیتے جو اسے رفتہ رفتہ اس کی آخری منزل تک لے جاتا۔ تشخیصِ مرض ایسی ژرف نگہی سے کرنا اور عملی علاج کے لئے کہہ دینا کہ جس بدپرہیزی سے مرض پیدا ہوا ہے اسے علیٰ حالہ جاری رکھا جائے، علاج تو نہیں کہلا سکتا۔

بہر حال، اس پالیسی کے مرتبین نے، اس قدر صحیح تشخیص کے بعد علاج کی منزل میں پہنچکر، ہمیں پھر اس انتظار میں چھوڑ دیا کہ دیکھیں۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے ٭ مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

ــــــــــ (۰) ــــــــــ

کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں یہ رَو سی چل رہی ہے کہ انگریزی زبان کو ملک بدر کر دیا جائے۔ غور سے دیکھا جائے تو غیر شعوری طور پر اس کے پیچھے وہی جذبہ کارفرما ہے جس نے سرسیدؒ پر کفر و الحاد کے فتوے لگائے تھے۔ مرورِ زمانہ سے، اب کافر و مرتد کے الفاظ میں وہ پہلے جیسا زور نہیں رہا اسلئے اب ان کی جگہ، مغرب زدہ، فرنگی مآب، مادہ پرست جیسی اصطلاحات نے لے لی ہے، حتیٰ کہ اس سلسلہ کو اب یہاں تک پہنچا دیا گیا ہے کہ جس طرح، اگر کوئی کمبخت یہ کہہ دے کہ بھوکے کو روٹی ملنی چاہیئے تو اسے کمیونسٹ یا سوشلسٹ قرار دے دیا جاتا ہے، اسی طرح) اگر کوئی شخص انگریزی زبان کی حمایت میں ایک لفظ بھی کہہ دے تو اسے انگریز پرست۔ ٹوڈی۔ غلامانہ ذہنیت کا حامل، اور کیا نہیں ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ اس رَد کے حق میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ انگریزی زبان ہمارے عہدِ غلامی کی یادگار ہے اسلئے اسے دیس نکالا دے دینا ضروری ہے۔ اگر یہ ایسی ہی حکم ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر ریل گاڑی۔ موٹر کار۔ ہوائی جہاز۔ تار۔ ٹیلیفون۔ ریڈیو وغیرہ کو بھی کیوں نہ دیس نکالا دے دیا جائے کہ یہ بھی ہمارے عہدِ غلامی میں انگریزوں کے درآمد کردہ ہیں۔ اگر ہم انہیں سینے سے چپکائے پھرنے سے غلامانہ ذہنیت سے ملوث نہیں ہو جاتے تو انگریزی زبان سے ہم کس طرح "بھرشٹ" ہو سکتے ہیں؟ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار عرض کر چکے ہیں) انگریزی زبان کی یہ خصوصیت نہیں کہ وہ انگریزوں کی زبان ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے بڑی عالمگیر حیثیت اور اہمیت اختیار کر لی ہے۔ ایک تو دنیا بھر کے علوم اس زبان میں منتقل ہو چکے ہیں اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اسلئے اس زبان سے بیگانہ ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو اتنے عظیم انسانی ورثہ اور متاع سے اپنے ہاتھوں محروم کر لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بین الاقوامی میدان میں، انگریزی زبان بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، باقی مسلم ممالک کے مقابلہ میں، ہمیں جو ایک قسم کی لیڈرشپ حاصل ہو گئی تھی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم اپنے مقدمہ کو جس وضاحت اور طلاقت سے (انگریزی زبان میں) پیش کرتے تھے، اس کے مقابلہ میں باقی مسلم ممالک بالکل گونگے نظر آتے تھے۔ آپ اپنے ہاں انگریزی کی اہمیت کم کیجئے تو دیکھئے گا کہ ایک ہی نسل کے بعد، ہمارا شمار بھی کس طرح انہی گونگوں میں ہونے لگ جاتا! حقیقت یہ ہے کہ خود حصولِ تشکیلِ پاکستان میں ایک بڑا حصہ ہماری انگریزی دانی کا تھا۔ اگر ہم سرسید کی فتاویٰ آزمائی جرأت کے صدقہ انگریزی سے آشنا نہ ہوتے، تو ڈاکٹر ہنٹر کے الفاظ میں، ہمارا مقام ہندوؤں کے ہیزم کشوں (لکڑہاروں) میں ہوتا۔

یہ ہے انگریزی زبان کی اہمیت۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ جدید تعلیمی پالیسی کے مرتبین بھی اس رَو سے متاثر ہو رہے ہیں اور انہوں نے بھی انگریزی کی اہمیت ختم کرنے کی سفارشات کر دی ہیں۔ ہمارے نزدیک، یہ اقدام بڑا مضرت رساں ہوگا اور اس کے نتائج بڑے دور رس۔ اس لئے ہمیں اس باب میں بڑے سوچ بچار

کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انگریزی زبان کے ذریعے غیر اسلامی تصورات و نظریات ہمارے ہاں عام ہو جاتے ہیں اسلئے اس زبان کی اہمیت ختم کر دینی چاہیئے۔ یہ دلیل جس قدر مغالطہ آفریں ہے ظاہر ہے۔ یہ اسی قسم کی دلیل ہے جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ سینما اور ٹی۔ وی میں فحش تصاویر دکھائی جاتی ہیں اور ریڈیو سے فلمی گانے نشر ہوتے ہیں اسلئے (فحش تصاویر اور گانوں کو نہیں بلکہ) سینما، ٹی۔ وی اور ریڈیو کے وجود کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے۔ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ (۱) جس انگریزی لٹریچر میں غلط خیالات کا پروپیگنڈہ کیا جائے اس کی درآمد اور اشاعت روک دی جائے۔ یہ کچھ بھی مشکل نہیں۔ اور (۲) اپنے ہاں انگریزی زبان میں ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو صحیح نظریات کا حامل ہو۔

ہم جدید تعلیمی پالیسی کی اس تجویز سے متفق ہیں کہ ہمارے ہاں بچوں کی تعلیم ان کی مادری زبان ہی میں ہونی چاہیئے۔ لیکن اس سے متفق نہیں کہ آگے چل کر انگریزی زبان کو ثانوی و بااختیاری مضمون کی حیثیت دی جائے

(۶)

ایک سفارش میں کہا گیا ہے کہ غیر ملکی مشنریوں نے پاکستان میں جو اسکول اور کالج کھول رکھے ہیں انہیں حکومت اپنی تحویل میں لے لے۔ یہ سفارش نہایت اہم اور ملک اور قوم کے ایک بہت بڑے تقاضا کو پورا کرنے والی ہے۔ ہم گزارش کریں گے کہ اس پر بلا تاخیر عمل کیا جائے۔ یہ ادارے جس غیر محسوس طریق سے عروقِ ملت میں زہر داخل کرتے رہتے ہیں اس کا اندازہ وقتِ نظر ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کا وجود جسدِ ملت میں ناسور کا حکم رکھتا ہے۔ ان کی یہ زہر فشانی تعلیمی اداروں تک ہی محدود نہیں ان کا جال سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کے مقاصد سیاسی ہیں اور بہروپ مختلف۔ ہمارے نزدیک تو یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان کو کاملۃً ان مشنریوں کے وجود سے پاک اور صاف کیا جائے۔ لیکن اگر یہ اقدام سردست ممکن نہ ہو تو ان کے تعلیمی اداروں کا فی الفور حکومت کی تحویل میں لیا جانا ضروری ہے۔ اس میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتنی چاہیئے۔ قرآن کریم نے جب کہا تھا کہ "غیروں کو اپنے اندرونی معاملات میں دخیل نہ ہونے دو اور انہیں اپنا رازدار نہ بناؤ" تو یہ بڑی بنیادی تاکید تھی۔ ان مشنریوں کا وجود ملک کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا ان کی جڑیں کہاں کہاں تک پہنچی ہیں۔ بہرحال ہم جدید تعلیمی پالیسی کی اس سفارش پر انہیں مستحق تہنیت سمجھتے ہیں۔

(۷)

مستبد حکومتوں کا ایک شعار یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ قوم کو طبقات میں تقسیم کرتی رہتی ہے۔ انگریزوں نے اس سلسلہ میں بڑے حربے استعمال کئے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ طبقۂ امرا کے لڑکوں کے لئے ایچی سن (چیفس)

کالج کھولا۔ اس میں تعلیم تو یونہی برائے نام ہوتی تھی۔ لیکن ان بچوں کے ذہن میں تکبر، نخوت اور باقی افراد قوم سے نفرت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے جاتے تھے۔ انگریز چلا گیا لیکن یہ تعلیم بدستور باقی رہی ہے۔ بدستور ہی نہیں بلکہ اس میں اور اضافہ ہوا اور "پبلک سکولوں" کے نام سے ایسے تعلیمی ادارے وجود میں لائے گئے جن میں پبلک (عوام) کے بچوں کا داخلہ عملاً ناممکن ہے۔ ان میں صرف امراء کے بچے داخلہ لے سکتے ہیں۔ یوں ملک میں طبقاتی تفریق کی خلیج اور بھی وسیع کر دی گئی۔ چونکہ ان (پبلک) سکولوں میں ٹیپ ٹاپ زیادہ ہوتی ہے اور طالب علم امیر گھرانوں کے بچے ہوتے ہیں، اسلئے حکومت کے بلند مناصب اور معاشرہ کے ارفع مقامات تک انہی کی رسائی ہوتی ہے۔ اس سے خود اپنی آزاد قوم میں "حاکم و محکوم" کی انسانیت سوز تفریق نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ اس کی گرہیں اور بھی مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ہمیں خوشی ہوئی کہ جدید تعلیمی پالیسی کے مرتبین نے ان اسکولوں کے مسئلہ کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ انہوں نے یہ سفارش کی ہے کہ ان سکولوں میں داخلہ قابلیت کے معیار کے مطابق ہو، اور جو سکول حکومت کی تحویل میں ہیں، ان کے غیر مستطیع طلباء کے اخراجات حکومت برداشت کرے، اور پرائیویٹ سکولوں میں پچیس فیصد غیر مستطیع طلبا کو یہی رعایت دی جائے۔ ہر چند یہ اس مسئلہ کا مکمل حل نہیں، لیکن یہ صحیح علاج کی طرف پہلا قدم ضرور ہے جو بہر حال مستحسن ہے۔ (بہ حیثیتِ مجموعی مسئلہ تعلیم کا صحیح حل کیا ہے، اسے ہم، اس تبصرہ کے آخر میں پیش کریں گے۔)

جہالت (یعنی تعلیم سے تہی دامنی) کس طرح انسان کو قامتِ انسانیت تک پہنچنے سے روکتی، اور قومی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتی ہے، ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے کسی ارسطو کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ جدید پالیسی میں اس اہم مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور اس کی اہمیت کو بڑی عمدگی سے نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے لئے علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ (۱) پرائمری (پانچویں جماعت) تک تعلیم مفت ہو۔ (۲) چھٹی سے آٹھویں جماعت تک لڑکیوں سے کوئی فیس نہ لی جائے اور لڑکوں میں سے بیس فیصد کی فیس معاف ہو۔ علاوہ بریں، تعلیم بالغاں کے لئے معلمین کا ایک "لشکر" تیار کیا جائے۔ اس لشکر کے لئے "انٹرمیڈیٹ پاس شدہ لڑکوں اور میٹرک پاس شدہ لڑکیوں کو، جن کی عمر اٹھارہ سے باتیس سال کے درمیان ہو، دو سال کے لئے جبراً بھرتی کیا جائے اور مفت رہائش اور خوراک کے علاوہ انہیں کچھ جیب خرچ دیا جائے۔ ان کا کام بالغوں کو تعلیم دینا ہو۔

اس علاج کے تجویز کرنے والوں کا ارادہ تو بڑا نیک نظر آتا ہے۔ لیکن، اپنی قوم اور ملک کے حالات

کے پیشِ نظر ہمیں خدشہ ہے کہ یہ اسکیم کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ جہاں تک بچوں کی ابتدائی تعلیم کا سوال ہے، ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ غریب گھروں کے والدین (اور ہمارے ہاں یہ "غریب گھر" ملک کی اسّی پچاسی فیصد آبادی کو محیط ہیں) اپنے بچوں کو چھوٹی عمر ہی سے اپنے ساتھ کام پر لگا لیتے ہیں۔ اگر اس عمر میں بچے کو سکول بھیج دیا جائے تو وہ اس کام کو سیکھ نہیں سکتا جس نے اس کے لئے ذریعہ معاش بننا تھا اور پرائمری تک کی تعلیم اس کے لئے وجہ معیشت بن نہیں سکتی۔ اسلئے وہ نہ ادھر کا رہتا ہے، نہ اُدھر کا بنتا ہے۔ علاوہ بریں تعلیم کا خرچ، فیس تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ اسکے علاوہ کتنے ہی متفرق اخراجات اور ہوتے ہیں جنہیں غریب والدین پورا نہیں کر سکتے — وہ تو بچے کو ایسے اُجلے کپڑے بھی نہیں پہنا سکتے جن میں ملبوس وہ اسکول جا سکے۔

جہاں تک، جبری معلّمین کا تعلق ہے، یہ اور بھی مشکلات پیدا کرے گا۔ غریب ماں باپ دن گن رہے ہوتے ہیں کہ کب بچہ دسویں پاس کر کے ملازم ہو اور چار پیسے کما کر لائے۔ اگر اسے، میٹرک کے بعد، دو سال تک جبراً ایسی حالت میں رکھا جائے جس میں وہ اپنے والدین کو کچھ نہ دے سکے، تو اس سے جو شکایات پیدا ہوں گی ان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ باقی رہیں لڑکیاں، تو ان کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ ان کے لئے اٹھارہ سے بائیس سال کی عمر شادی کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں انہیں جبراً معلّمہ بنائے رکھنے سے جو الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ علاوہ بریں، ان جوان ناکتخدا لڑکیوں کو جب ان کے گھروں سے دور علاقوں میں بھیجا جائے گا تو (بحالاتِ موجودہ) ان کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا؟

ان حالات کے پیشِ نظر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اسکیم نہ صرف یہ کہ ممکن العمل نہیں ہو سکے گی بلکہ بہت سی پیچیدگیوں کا موجب بن جائے گی۔ اگر طالب علم رضاکارانہ طور پر اس لشکر میں بھرتی کے لئے آمادہ ہوں تو ان سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔ اس میں جبری بھرتی کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے۔ اصل یہ ہے کہ قوم کا بنیادی مسئلہ معاشی ہے اور باقی مسائل بیشتر اسی محور کے گرد گردش کرتے ہیں۔ جب تک یہ بنیادی مسئلہ حل نہیں ہوتا، دیگر مسائل کی دشواریوں پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

—————— (۰) ——————

جدید پالیسی میں اس دلخراش حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ اساتذہ کی تنخواہیں ذلت آمیز حد تک کم ہیں اور جب تک انہیں فکرِ معاش سے آزاد نہیں کیا جاتا، کوئی تعلیمی اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس احساس کے بعد، اس مسئلہ کے حل کے لئے سرِدست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ — (۱) ایجوکیشنل سروس میں کلاسز (کلاس I، کلاس II، کلاس III) کی تخصیص مٹا دینی چاہیئے اور (۲) تمام اساتذہ کے لئے تنخواہ کا ایک ہی نیشنل سکیل مقرر کرنا چاہیئے جو دیگر سرکاری ملازمتوں کا لگا کھائے۔ پالیسی میں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ سکیل کیا ہونا چاہیئے

حالانکہ یہی وہ سوال تھا جس کی طرف تمام اساتذہ (بلکہ قوم) کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔

ہم پھر دہرا دیں کہ بنیادی مسئلہ معاشی ہے' اور اس مسئلہ کا کوئی مثبت حل' اس مقام پر بھی پیش نہیں کیا گیا۔ زندگی کے دیگر معاملات میں' انسان کسی حد تک وعدوں پر جی سکتا ہے۔ روٹی کے معاملہ میں نہیں۔ جینے کے لئے روٹی کا وعدہ نہیں' خود روٹی درکار ہوتی ہے۔ اور انسانی زندگی کے لئے عزت کی روٹی (جسے قرآن "رِزْقٌ کَرِیْمٌ" کہہ کر پکارتا ہے) جن صورت گروں (معلمین) نے آدمی کے بچے کو انسان بنانا ہو' ان کے لئے خود انسانی سطح پر زندگی بسر کرنا کسقدر ضروری ہے' اس کے متعلق دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ اس معاملہ میں جس قدر تاخیر ہوتی جائے گی' قوم "انسانوں" سے محروم ہوتی جائے گی۔

(۰)

جدید پالیسی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک میں تعلیمی معیار کی پستی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ اس کا علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ان درسگاہوں کو بذریعہ قانون مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے معیار کو سرکاری درسگاہوں کی سطح پر لے آئیں۔

پالیسی کے مرتبین نے اس مسئلہ کیطرف بھی اپنی توجہ منعطف کی۔ اچھا کیا۔ لیکن ہم تو یہی نہیں سمجھ سکے کہ ملک میں پرائیویٹ سکول یا کالج موجود ہی کیوں ہیں؟ انگریزوں کو اپنی سرکاری ضرورت کے لئے تعلیم یافتہ نوجوان درکار ہوتے تھے۔ اس کے لئے وہ اپنی ضرورت کے مطابق سکول یا کالج کھول لیتے تھے۔ قوم کے باقی حصے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی اسلئے ان کی تعلیم کی انہیں فکر ہی نہیں ہوتی تھی۔ باقی قوم اپنے بچوں کی تعلیم کا آپ انتظام کرتی تھی۔ اس کے لئے پرائیویٹ سکول یا کالج قائم کئے جاتے تھے۔

اب قوم کی اپنی حکومت ہے جس کا اولین فریضہ قوم کے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اسلئے اب سرکاری اور پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں کی تخصیص کے معنی کیا ہیں؟ لیکن جس طرح ابتک "گورنمنٹ" سکول یا کالج الگ ہیں اور "اسلامیہ" سکول اور کالج الگ (حالانکہ اب گورنمنٹ کو خود اسلامی ہونے کا دعویٰ ہے) اسی طرح سرکاری سکول اور کالج الگ ہیں اور پرائیویٹ الگ! حقیقت یہ ہے کہ سو سال کی غلامی' ہمارے ذہنوں کو اس طرح ماؤف اور ہماری فکری صلاحیتوں کو ایسے مفلوج کر گئی ہے کہ' جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے' ہم کبھی رک کر اس پر غور ہی نہیں کرتے کہ اسے بدستور جاری رہنا چاہیئے یا' آزادی کے بعد' اس میں کوئی تبدیلی ہونی چاہیئے! آزادی کے بعد' تبدیلی صرف اس قدر ہوئی ہے کہ غلامی کے زمانہ میں' پرائیویٹ سکول یا کالج وہ حضرات کھولتے تھے جن کے سینے درد ملت سے لبریز اور جن کی آنکھیں قومی بہبود کے لئے محروم خواب ہوتی تھیں۔ ایثار اور قربانی ان کا شیوہ اور خدمت اور محنت ان کا شعار تھا۔ لیکن اب پرائیویٹ درسگاہیں کھولنا

پیشہ بن چکا ہے ـــ اور بڑا منفعت بخش پیشہ، اور جو لوگ یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر کے "ہسٹری شیٹ" کھلے ہوتے ہیں۔ لہٰذا، اس مسئلہ کا حل وہ نہیں جسے اس پالیسی میں تجویز کیا گیا ہے۔ حل وہ ہے جسے ہم اس تبصرہ کے آخر میں پیش کر رہے ہیں۔

(۰)

زیرِ نظر پالیسی میں ایک باب میں، عورتوں کی تعلیم کے مسئلہ کو خصوصیت سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ہمارے ہاں، تعلیم کے میدان میں عورتوں کی پسماندگی کی وجوہات (۱) اقتصادی اور (۲) معاشرتی بتائی گئی ہیں۔ اقتصادی دشواری کا حل یہ تجویز کیا گیا ہے کہ آٹھویں جماعت تک لڑکیوں کی تعلیم مفت ہو۔ یعنی ان کی فیس معاف ہو۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، اتنی سی رعایت سے اقتصادی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ویسے بھی، آٹھویں جماعت تک تو محض نوشت و خواند تک نوبت آتی ہے۔ تعلیم اس کے بعد (بلکہ کالج میں جا کر) شروع ہوتی ہے ـــ کتنے والدین ہیں جو دو چار بیٹیوں کا، کالج کی تعلیم کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں؟ اور اگر وہ کسی نہ کسی طرح، ان اخراجات کو برداشت کر بھی لیں، تو اس کے بعد، ان بچیوں کو گھر سے وداع کرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں رہتا اور یوں یہ تعلیم، ان کے اور خود ان بچیوں کے لئے، بار و دوش ہی نہیں، وبالِ جان بن جاتی ہے۔

جہاں تک معاشرتی پہلو کا تعلق ہے، پالیسی میں کہا گیا ہے کہ عورتوں کے لئے (مخلوط کے بجائے) جداگانہ تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے اور لیڈی ٹیچرز کو خاص مراعات دینی چاہئیں ـــ مثلاً مفت سواری کا انتظام۔ رہائش کے مسئلہ میں امداد۔ بعض اسامیوں کے لئے خاص تنخواہ وغیرہ۔

لیکن ہمارے ہاں کا معاشرتی مسئلہ اتنا ہی نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ وسیع، گہرا اور پیچیدہ ہے، اور یہ وہ دشواریاں ہیں جو ہر اس قوم کو پیش آتی ہیں جو قدامت پرستی اور زندگی کے جدید تقاضوں کے برزخ میں معلق ہو۔ ہمارے ہاں لڑکیوں نے "گھریلو زندگی" (بطور HOUSE - WIFE) بسر کرنی ہوتی ہے۔ اس میں استثناء، ہزاروں میں سے ایک آدھ ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم سے معلومات میں اضافہ اور ذہنوں میں جلا پیدا ہو جاتی ہے، لیکن ہمارے نظامِ تعلیم میں کوئی عنصر ایسا نہیں جس سے ایک لڑکی، مرد کی رفیقِ حیات بن کر مصائبِ زندگی میں خاوند کے دوش بدوش چلنے کے قابل بن سکے، یا بچوں کی تربیت اس نہج پر کر سکے جس سے وہ نسلِ انسانی میں قابلِ قدر اضافہ بن جائیں۔ یہ وجہ ہے کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی، شادی کے بعد، محسوس کرتی ہے کہ اس نے حصولِ تعلیم کے لئے یونہی وقت ضائع کیا۔

اب رہیں وہ لڑکیاں جو کسی قسم کے (CAREER) کے لئے تعلیم حاصل کرتی ہیں، تو ہمارے معاشرہ

میں عورت کو اپنی حفاظت کے لئے عمر بھر مرد کی چھت کی ضرورت رہتی ہے ۔۔ لڑکی کو باپ کی چھت کی۔ بیوی کو خاوند کی چھت کی۔ اور ماں کو بیٹے کی چھت کی ۔۔۔ یہ ضرورت "کیرئیر گرل" (آزادانہ کام کرنے والی لڑکی) کو بھی برابر رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے باپ کی چھت ساری عمر کے لئے قائم نہیں رہ سکتی۔ باپ نے نسبتاً جلدی دنیا کو چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ اس کی وفات کے بعد (اور بعض اوقات اس کی زندگی میں بھی) اس لڑکی کے لئے کوئی چھت نہیں رہتی۔ اُس وقت وہ عمر میں بھی اتنا آگے بڑھ چکی ہوتی ہے کہ اسے مناسب رفیقِ زندگی نہیں ملتا۔ اُس وقت وہ اپنے آپ کو عجیب معلق حالت میں پاتی ہے اور ایسی کشمکش سے دوچار رہتی ہے جس کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی (آنے والی) دشواری کے پیشِ نظر، اکثر لڑکیاں، ڈاکٹری وغیرہ کی ٹیکنیکل تعلیم مکمل کر لینے کے بعد، جلدی سے شادی کر لیتی ہیں۔ لیکن یہ حل بھی زیادہ دیر تک کامیاب ثابت نہیں ہوتا۔ اگر وہ گھر کی زندگی اور اپنے فنی کام، دونوں کو ساتھ ساتھ جاری رکھتی ہے تو نہ گھر کی زندگی کامیاب ہوتی ہے نہ فنی کام۔ آخر الامر اسے فنی کام چھوڑنا اور صرف (HOUSE-WIFE) بن کر رہ جانا پڑتا ہے۔ اس سے اسے انفرادی طور پر تو یہ نقصان پہنچتا ہے کہ اپنا پسندیدہ فنی کام چھوڑنے کا قلق اس کے دل سے جاتا ہی نہیں اور وہ اس کی ذمہ دار اپنی گھر کی زندگی کو قرار دیتی ہے۔ اسلئے اس زندگی سے اسے محبت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اسے ہمیشہ اپنی عزیز اور محبوب متاعِ حیات کی غارت گر سمجھتی ہے۔ یہ ہوتا ہے ان کا ذاتی نقصان۔ جہاں تک اجتماعی نقصان کا تعلق ہے، قوم ان کی فنی خدمات سے محروم ہو جاتی ہے۔ ذرا سامنے لائیے اس حقیقت کو کہ (مثلاً) قوم کو لیڈی ڈاکٹروں کی کس قدر ضرورت ہے اور ایک طالبہ کو لیڈی ڈاکٹر بنانے میں قوم کا کس قدر سرمایہ صرف ہوتا ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اگر ایک سال بیس لیڈی ڈاکٹروں کا گروہ کالج سے نکلتا ہے تو تین چار سال کے بعد ان میں سے بمشکل دو چار لڑکیاں ڈاکٹر رہ جاتی ہے۔ باقی سب گھر کی زندگی میں جذب ہو جاتی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کس قدر قومی نقصان ہے۔ یہ نتیجہ ہے معاشرہ کی موجودہ "برزخی" حالت کا۔

باقی رہا مخلوط یا جداگانہ تعلیم کا سوال۔ سو یہ مسئلہ ایک مستقل موضوع ہے اور جداگانہ گفتگو کا متقاضی۔ ہم اس سے متفق ہیں کہ معاشرہ کی جو موجودہ حالت ہے، اس میں قوم کی بچیوں کو انسان نما درندوں کے دندانِ حرص و آز سے بچانا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اربابِ قوم سے اتنا دریافت کرنے کی بھی اجازت چاہتے ہیں کہ کیا یہ صورتِ حال کسی قوم کے لئے بھی باعثِ فخر کہلا سکتی ہے کہ اگر اس کے مرد اور عورتیں کسی جگہ اکٹھے مل بیٹھیں تو قوم کا دل دھڑکنے لگ جائے کہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو؟ کیا یہ امر کسی قوم کے مردوں کے لئے باعثِ ہزار شرم و ندامت نہیں کہ ان کے متعلق ہر وقت یہ خدشہ لاحق رہے کہ اگر انہیں بیگانی

عورتوں کے ساتھ ذرا بھی خلا ملا کا موقعہ ملیگا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکیں گے؟ کیا انسان کی پستیِ کردار کی اس سے زیادہ شرمناک مثال کوئی اور بھی ہوسکتی ہے؟ ہم نے یہاں "مردوں" کو اسلئے مختص کیا ہے کہ اگر مرد اپنے جذبات پر قابو رکھے تو عورت کی ہزار آمادگی اور بے باکی بھی لغزش کی صورت پیدا نہیں کرسکتی۔ قرآنِ کریم میں داستانِ حضرت یوسفؑ کو اسی عظیم حقیقت کو سامنے لانے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اس مسئلہ کا مستقلاً حل یہ سوچتے ہیں کہ عورتوں کو صندوقوں میں بند کرکے رکھا جائے۔ کیا اس سے ہم اپنے مردوں کے منہ پر یہ کہہ کر طمانچہ نہیں مارتے کہ ہمیں تم پر اتنا بھی اعتماد نہیں کہ اگر تمہیں ذرا سا بھی موقعہ مل جائے تو تم اپنے جذبات پر قابو رکھ سکو! اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنے معاشرہ میں "زلیخاؤں" کے وجود کے قائل نہیں۔ "زلیخائیں" ہر معاشرہ میں ہوتی ہیں۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر مرد "سیرتِ یوسفیؑ" کے حامل ہوں، تو زلیخاؤں کے ہزار مکائد بھی معاشرہ میں بدنہادی پیدا نہیں کرسکتے۔ نہ ہی وہ معاشرہ اپنے آپ کو قابلِ ستائش قرار دے سکتا ہے جس میں عورتوں کو پابندِ سلاسل کرکے، مرد اس بات پر فخر کریں کہ ہم لغزش سے معصوم ہیں۔ اسے "عصمت بی بی از بیچارگی" کہا جائیگا نہ کہ سیرت کی پاکیزگی اور کیریکٹر کی پختگی۔ مردوں کی پاکیزگیٔ سیرت کا معیار وہ ہے جس کے متعلق حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ میں وہ نظام قائم کرنے آیا ہوں جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ایک عورت تنہا یمن سے چل کر شام تک سفر کریگی۔ اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ معاشرہ میں یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب مرد اور عورت دو انسانوں کی حیثیت سے آپس میں ملیں اور جنسی تفاوت کو صرف فطرت کے متعین کردہ فرائض تک محدود رکھا جائے۔ یعنی مرد اور عورت کے حیاتیاتی تفاوت (BIOLOGICAL DIFFERENCE) تک۔ انسان ہونے کی حیثیت سے ان دونوں میں کوئی فرق نہ کیا جائے۔

یہ بات ضمناً سامنے آگئی تھی

———(۰)———

نظامِ تعلیم میں بنیادی مسئلہ نصاب اور درسی کتابوں (ٹیکسٹ بکس) کا ہے۔ یعنی اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کہاں پڑھایا جاتا ہے۔ کیسے پڑھایا جاتا ہے۔ کون پڑھاتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا پڑھایا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کسی قوم کے تعلیمی مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں جدید پالیسی میں اتنا ہی کہا گیا ہے کہ سکالرز (اربابِ علم و فضل)، رائٹرز (مصنفین) اور ایجوکیشنسٹس (ماہرینِ تعلیم) کی کمیٹیاں متعین کی جائیں تاکہ وہ نصاب اور درسی کتب جلد از جلد تیار کریں، اور یہ کتابیں طباعت وغیرہ کے مراحل سے گزر کر ۱۹۷۰ء کے تعلیمی سال کے لئے بروقت تیار ہوسکیں۔

ہمارے خیال میں یہ بنیادی مرحلہ اتنی عجلت سے طے کرنے کا نہیں۔ یہ بڑے ہی غور و فکر اور تحقیق و کاوش کا محتاج ہے۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پہلے اربابِ علم و فضل اور ماہرین تعلیم کی کمیٹیاں، نصاب (CURRICULUM) کے مسئلہ پر غور و فکر کریں۔ ان حضرات کو پوری پوری آسائشیں مہیا کی جائیں اور انہیں فکرِ روزگار سے آزاد کیا جائے تاکہ وہ پوری توجہ اور تن دہی سے اس اہم فریضہ کو سرانجام دے سکیں۔ جو کچھ وہ طے کریں اسے ملک میں تنقید و مشورہ کے لئے عام کیا جائے۔ اس کے بعد، اربابِ قلم (مصنفین) کو دعوت دی جائے کہ وہ ان طے شدہ اصولوں کے مطابق کتابوں کے مسودات تیار کریں۔ انہیں بھی کام کرنے کی پوری پوری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور معاشی پریشانیوں سے آزاد کیا جائے۔ ان مسودات پر، اول الذکر کمیٹیاں تنقیدی نگاہ ڈالیں اور وہ جس مسودہ کو جس شکل میں منظور کریں، اسے طباعت کے لئے دے دیا جائے۔ اس میں وقت تو ضرور کچھ زیادہ صرف ہوگا لیکن کام کی کتابیں اسی صورت میں مرتب ہو سکیں گی۔ کتابوں کی طباعت وغیرہ کا کام بھی خود حکومت کی زیرِ نگرانی ہونا چاہیئے تاکہ ان میں غلطیاں نہ رہیں۔ جن کمیٹیوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے انہیں مستقل طور پر قائم رہنا چاہیئے تاکہ وہ جائزہ لیتی رہیں کہ منظور کردہ کتابیں کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہیں اور ان میں کس قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت ہے۔ بالخصوص ان علوم سے متعلق کتابوں میں، جن میں نت نئے دن اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

(۰)

یہ ہیں جدید پالیسی کے اہم نکات جن کا تعلق نظامِ تعلیم سے ہے۔ باقی امور کا تعلق انتظامی امور سے ہے جن کا جائزہ لینا ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ ان میں سے ایک شق یہ بھی ہے کہ جو طالب علم آخری امتحان میں فیل ہو جائے اسے صرف ایک موقعہ اور دیا جائے۔ اگر وہ اس میں بھی کامیاب نہ ہو تو اسے درس گاہ سے خارج کر دیا جائے۔ اور اس کے بعد وہ بطور پرائیویٹ امیدوار امتحان دے سکے۔

اس تجویز کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہ "طالب علم" جو خاص مقاصد کے ماتحت کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتے ہیں اور پھر تیس تیس چالیس چالیس سال کی عمر تک "طالب علم" ہی بنے رہتے ہیں، وہ دو سال سے زیادہ طلبا کی صف میں نہیں رہ سکیں گے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو طالب علم اس طرح پرائیویٹ حیثیت سے امتحان میں تین بار فیل ہو جائے اسے پاس تصور کر کے ڈگری دیدی جائے۔

اس تجویز کی افادیت کم از کم ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ معلوم نہیں کہ "مستند جہلا" کے ان لشکروں کا مصرف کیا ہوگا؟ یہ تختۂ مشق بن کر رہ جائینگے جو نہ قابلِ سوختن ہوتا ہے نہ درخورِ فروختن!

(۰)

جدید پالیسی کے مختلف نکات پر تبصرہ ختم ہوا۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ رخصت لینے سے پہلے، ہم مختصر الفاظ میں دہرادیں کہ ہمارے نزدیک نظامِ تعلیم کا تصور کیا ہے اور اسکے متشکل ہونے کی صورت کیا۔ ہم نے "دہرادیں" اسلئے کہا ہے کہ ہم ان تجاویز کو اس سے پہلے کئی بار قوم کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ حکومت کی طرف سے پہلی دفعہ قوم کو دعوتِ مشاورت دی گئی ہے اسلئے ہم انکا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارا فریضہ انہیں ارباب متعلقہ کے سامنے پیش کر دینا ہے۔ ان پر غور و فکر اور رد و قبول ان کا منصب ہے۔

ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم نے تعلیم کے مسئلہ کو افرادِ قوم کا انفرادی اور ذاتی معاملہ قرار دے رکھا ہے۔ یعنی جس شخص کا بچہ ہے وہی اسکی پرورش اور تعلیم کا ذمہ دار ہے۔ حکومت اسے صرف کچھ آسانیاں بہم پہنچاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں افراد، اپنے بچوں کا مستقبل اپنی منشاء، مفاد اور مقاصد کے مطابق متعین کریں گے۔ اسی بنیادی غلطی سے وہ تمام خرابیاں جنم لیتی ہیں جن کے ازالہ یا دفعیہ کے لئے یہ ساری کوششیں کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کے باوجود یہ خرابیاں، نہ صرف یہ کہ دور نہیں ہوتیں بلکہ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ صحیح نظریہ اجتماعیت کے مطابق بچے افراد کی "ذاتی ملکیت" نہیں بلکہ قوم کا گراں بہا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اور یہ مملکت کا فریضہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے اور اس کا ایسا انتظام کرے جس سے ان بچوں کی انسانی صلاحیتیں نشوونما پاکر قوم کی فلاح و بہبود اور انسانیت کی نشوو ارتقا کا موجب بن جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ابتداءً تمام بچوں کو یکساں تعلیم دی جائے اور اس امر کا جائزہ لیتے جائیں کہ کون سا بچہ کن امکانی صلاحیتوں کا مالک ہے، اس کا رجحانِ طبیعت کس طرف ہے۔ اس کا مذاق کیسا ہے۔ اس میں قوم کی کلی شیرازی اور انسانیت کی صف میں کس مقام پر فٹ ہو جانے کے آثار ہیں۔ اس اندازے کے جائزے کے مطابق، ان بچوں کو مختلف چھلنیوں میں چھانتے چلے جائیں۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے جائیں کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں، قوم کی ضروریات کیا ہیں۔ متعلقہ صلاحیتوں کے حامل طالب علموں کو ان ضروریات کے مطابق، مختلف شاخوں میں بانٹتے چلے جائیں، اور اس میدان میں جس آخری حد تک پہنچنے کی صلاحیت ان میں موجود ہو انہیں اس حد تک پہنچایا جائے۔ یوں یہ نظامِ تعلیم، مملکت کے بلند و بالا مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن سکیگا۔ اور چونکہ ایک اسلامی مملکت کے قومی اور اسلامی مقاصد ایک ہی ہوتے ہیں، اسلئے یہ نظامِ تعلیم اسلامی مقاصد کی برومندی کا بھی ذریعہ بن جائے گا۔ اس میں سرکاری اور غیر سرکاری۔ اور پرائیویٹ اور پبلک اسکولوں اور کالجوں کا امتیاز بھی اٹھ جائے گا اور امیر اور غریب گھرانوں کے بچوں کی تخصیص بھی ختم ہو جائے گی۔ اسی سے وہ امت وجود میں آسکیگی جسے قرآن اُمَّةً وَّسَطًا کہہ کر پکارتا ہے۔

جہاں تک اسلامی تعلیم کا تعلق ہے اس سے مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ طالب علموں کا قلب و دماغ صحیح

اسلامی قالب میں ڈھل جائیں اور ان میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں یہ فیصلہ کر سکیں کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔ اس کے لئے انہیں ان مستقل اقدار کی تعلیم دی جائے جنہیں قرآن کریم نے شرفِ انسانیت کی برومندی کے لئے مکمل اور ابدی طور پر اپنے اوراق میں محفوظ کر رکھا ہے اور جن کا عملی مظاہرہ حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ میں درخشاں ہے۔ اسکول کے درجہ تک اتنی تعلیم ہی دی جائے۔ کالج کے درجہ میں پہنچ کر تاریخ کو شاملِ نصاب کر دیا جائے۔ اس ضمن میں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ مسلمانوں کی تاریخ اور اسلام کی تاریخ میں بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھ کر دونوں تاریخوں کی تعلیم متمیز حیثیت سے دی جائے اور اس کی خاص احتیاط برتی جائے کہ تاریخ کو خالصتہً معروضی طریق پر (OBJECTIVELY) پڑھایا جائے۔ فقہ اور حدیث کو قانون کی تعلیم (لاء کالج) کا شعبہ قرار دیا جائے۔ ضمناً، اصولی طور پر عربی زبان کا جاننا ہر طالب علم کے لئے ضروری ہونا چاہیئے۔ لیکن تاریخ۔ فقہ۔ حدیث۔ کے طلباء کے لئے اسے لازمی قرار دیا جائے تاکہ وہ ان کے اصل ماخذ سے از خود استفادہ کر سکیں۔ قانون کے یہی فارغ التحصیل طالب علم مزید ریسرچ کے بعد حکومت کے محکمہ قانون اور نظامِ عدل سے متعلق ہو جائیں۔ اس سے سیکولر سکولوں، کالجوں اور دینی مکتبوں اور دار العلوموں کی تفریق بھی ختم ہو جائے گی (کیونکہ مکتبوں اور دار العلوموں کی الگ ضرورت ہی نہیں رہے گی) اور وہ ثنویت بھی مٹ جائے گی جس کی موجودگی میں اسلام کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک زندگی کے روزمرہ کے معاملات میں "مسائلِ شریعت" معلوم کرنے کا تعلق ہے، اس کے لئے، نہایت سہل اور سادہ الفاظ میں ایک مختصر سی کتاب، ثانوی درجہ میں داخلِ نصاب اور ملک میں اس کی اشاعت عام کر دی جائے۔ اس سے قدم قدم پر، ایک الگ مذہبی پیشوا کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہر مسلمان اپنا مذہبی پیشوا آپ ہوگا اور قانون سازی اور قانون کی ترجمانی کا فریضہ حکومت کے ذمہ ہوگا۔ اس طرح شجرِ ملت، پاپائیت کی اکاس بیل سے نجات پا سکیگا اور اسلام، ایک بار پھر اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں سامنے آ جائیگا۔ کیا حسین ہوگا یہ انقلاب!

یہ ہے مختصر الفاظ میں اس نظامِ تعلیم کا خاکہ، جسے ہماری بصیرت کے مطابق اسلامی مملکت میں رائج ہونا چاہیئے۔ محدود سے پیمانے پر اسی مقصد کے حصول کے لئے طلوعِ اسلام نے ایک اپنا کالج کھولنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا تعارف چند صفحات آگے چل کر آپ کے سامنے آئے گا۔

طلوعِ اسلام کالج

(اپنے انداز کی منفرد تعلیم گاہ)

اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی!

قوموں کا مستقبل ان کی اُبھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس قسم کے آج کے نوجوان، اسی قسم کی کل کی قوم۔ اگر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائے گی۔ حصولِ پاکستان کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم اس آئیڈیالوجی کے مطابق کرتے جس کے تحفظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ہم نے اس مقدس فریضہ سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا اس قدر ماتم کر رہے ہیں۔ یہ قوم کونسی ہے جس کی ہم اس قدر شکایت کر رہے ہیں؟ یہ انہی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو تشکیلِ پاکستان کے وقت ہماری درسگاہوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہی طالبعلم بیس بائیس برس کے بعد اب ہماری قوم کا ہوشمند طبقہ بن گئے ہیں اور انہی کا رونا ہم آئے دن روتے رہتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ ہم قوم کی بے راہ روی کا رونا بھی روتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہر سال اسی قوم میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو نوجوان ہماری درسگاہوں سے غلط تعلیم حاصل کر کے باہر نکلتے ہیں، وہ ہماری قوم کے اجزاء بنتے ہیں۔ اس تباہی سے بچنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کریں۔

۲۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی، قرآن کریم کی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی تصور کے سوا اور کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے، وہ فیصلہ کر سکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس کا طریق یہ نہیں کہ دینی تعلیم کے لئے مکتب

اور دارالعلوم الگ کھولے جاتیں اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج الگ۔ دین اور دنیا کی یہ ثنویت یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ نہ ہی اس کا یہ طریق ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں ایک پیریڈ دینیات کا رکھ دیا جائے یا ایم اے کے لئے اسلامیات کا الگ مضمون تجویز کر لیا جائے۔ ان طریقوں سے طالب علموں کی معلومات میں تو کچھ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ان سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جسے علامہ اقبالؒ نے نہایت جامع الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ ع

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جائے کہ "دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے"۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں یا عمرانیات۔ تاریخ پڑھیں یا فلسفہ۔ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا ۔۔۔ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اُس پروگرام کی تکمیل کے لئے کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہا قرار دیا ہے۔ یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ

فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیِ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کیا جائے۔

اسے بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ قوم کے نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں وہ پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی جس کے فقدان کا ہم اس وقت اس قدر رونا روتے ہیں۔

(۳) طلوع اسلام اس امر کی مسلسل کوشش کرتا رہا کہ پاکستان کے نظامِ تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی ہو جائے جس سے مذکورہ صدر مقاصد حاصل ہو سکیں ۔۔۔ آپ اس کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اس نے کس اصرار و تکرار سے اربابِ نظم و نسق کی توجہ اس طرف منعطف کرائی۔ لیکن بدقسمتی کہ اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ نظامِ تعلیم دن بدن بگڑتا چلا گیا اور قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی پریشان نظری اور بے راہ روی ہر دیدۂ بینا کے لئے عبرت کا الم انگیز مرقع بنتی گئی۔ جب اُدھر سے قطعاً مایوسی ہو گئی تو کچھ عرصہ پہلے 'مفکرِ قرآن' محترم پرویز صاحب نے (کہ جن کی عمر انہی مقاصد کے حصول کی تگ و تاز میں گذری ہے) یہ تجویز پیش کی کہ دوسروں کی طرف نگاہِ امید لگائے رکھنے کے بجائے اس باب میں کیوں نہ خود ہی کوئی

عملی قدم اٹھایا جائے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ ایک اپنا کالج کھولا جائے جس میں عام تعلیم یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدہ کے مطابق ہو تاکہ وہاں کا فارغ التحصیل طالب علم زندگی کے کسی شعبے میں دوسرے کالجوں کے طالب علموں سے پیچھے نہ رہ جائے اور اس کے لئے مختلف میدان دوسرے طالب علموں کی طرح کھلے ہوں۔ لیکن اس کالج میں یہ مضامین اس طرح پڑھائے جائیں کہ طلبا کو ساتھ کے ساتھ معلوم ہوتا جائے کہ ان میں کونسی بات قرآنی تعلیم کے خلاف ہے اور قرآن کریم اس باب میں کیا نقطۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں قرآن کریم کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ

(۱) پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین کیا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔ افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ وہ کون سی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے۔ اور

(۲) دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی۔ معاشرتی۔ سیاسی۔ قومی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا جس کی وجہ سے اس عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے، قرآن کریم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نقطۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور خود اپنے ملک میں بھی دوسروں کی فکری راہ نمائی کر سکیں۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید مثال بن سکیں۔ اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت پیش کر سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائیں اور وہ سیرت نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ کے رکھیں تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تربیت کے لئے کالج کے ساتھ ہوسٹل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے ایک جدید طرز کی درسگاہ کے قیام کا پروگرام سامنے رکھا گیا۔ تجویز یہ تھی کہ اس کی ابتدا ایف۔ اے (سالِ اول) سے کی جائے اور اسے سال بہ سال آگے بڑھاتے چلے جائیں۔ اس کے بعد ابتدائی اسکولوں کی بنیاد رکھی جائے تاکہ شروع ہی سے بچوں کی تعلیم اسی نہج پر ہو۔ درسگاہیں

لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے قائم کی جائیں اور جب یہ سلسلہ چل جائے تو اس کے لئے ایک الگ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ انہی درسگاہوں میں اساتذہ تیار کئے جائیں۔ اس طرح یہ درسگاہیں ملک کے عام نظامِ تعلیم کے لئے نمونہ کا کام دے سکیں گی اور وہ نظام خود بخود اپنے آپ کو اس قالب میں ڈھال لیگا۔ اس سے پاکستان میں ایک نئی قوم تیار ہو جائے گی جو اس آئیڈیالوجی کی پیکر ہو گی جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

(۴) اس مقصد کے لئے "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی" کے نام سے ایک سوسائٹی متشکل کی گئی جسے حکومت کے ہاں سے باقاعدہ رجسٹرڈ کرا لیا گیا۔ اس کی ایک ایگزیکٹو کمیٹی بھی متعین کر لی گئی۔ سوسائٹی کے چیئرمین محترم پرویز صاحب ہیں جن کی قرآنی فکر کی روشنی میں اس کالج کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں قوم کے بچوں کو ایک گوشہ میں لے کر بیٹھ جائیں اور قرآنی شمع ان کے ہاتھ میں دے کر دنیا سے رخصت ہوں۔ ان کی اس آرزو کی برومندی بھی اسی اسکیم سے وابستہ ہے۔

(۵) کالج کی تعمیر کے لئے سب سے پہلا مرحلہ زمین حاصل کرنا تھا۔ زمین خریدنے کے لئے جس قدر ابتدائی سرمایہ کی ضرورت تھی اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے کوشش کی گئی کہ اراضی کہیں سے بطور عطیہ مل جائے لیکن اس میں ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر اس سال کے شروع میں بعض مخلص احباب کی طرف سے ایک ایسی اسکیم سامنے لائی گئی جس سے (بحمداللہ) یہ مرحلہ بآسانی طے ہو گیا۔ مختلف احباب نے ایک ایک کنال قطعہ اراضی کی پیشکش کر دی جس سے کافی رقبہ حاصل ہو گیا۔

لاہور میں، فیروزپور روڈ کے نہر کے پل سے، نہر کے ساتھ ساتھ، دو پختہ سڑکیں، جانب جنوب گئی ہیں۔ دائیں جانب یونیورسٹی کا نیو کیمپس ہے اور بائیں طرف یونیورسٹی کے ہوسٹل۔ ہوسٹل کی ان عمارات سے آگے بڑھ کر، لہلہاتے کھیت اور سرسبز و شاداب درخت قطار در قطار کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی پُرفضا ماحول میں یہ اراضی واقع ہے جس پر کالج کی عمارات تعمیر کی جائینگی۔

اس وقت تو یوں نظر آئے گا گویا کالج کسی بے آباد مقام پر تعمیر کیا جا رہا ہے لیکن جب یہ کالج تعمیر ہو گا تو اسے آپ ویرانے میں نہیں، آبادی میں مسکراتا پائینگے۔ کالج سے ملحقہ اراضی پر احباب کوا پریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی (لمیٹڈ) اپنی کالونی بسا رہی ہے اور کالج کے لئے زمین بیشتر اسی سوسائٹی کے اراکین کی پیشکش ہے۔ یوں یہ کالج، اپنے احباب کی ہمسائیگی میں پروان چڑھیگا۔

(۶) حصولِ اراضی کے بعد ملک کے اربابِ فکر و نظر کو دعوتِ مشاورت دی گئی (جس کا اعلان طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں کیا گیا تھا) یہ اجتماع ۲۲ جون کو پرویز صاحب کے درسِ قرآنِ کریم کے بعد انعقاد پذیر ہوا۔ اس میں قرآنی احباب نے جس جذب و شوق اور جوش و خروش سے اس اسکیم پر

لبیک کہا وہ کالج کی تاریخ میں یادگار رہیگا۔ ایک آدھ گھنٹہ کے اندر اندر حسبِ ذیل عطیات پکے ہوئے پھلوں کی طرح اس درسگاہ کی جھولی میں آگرے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

۱۔ کمروں کی تعمیر

حسبِ ذیل احباب نے کالج کے لئے ایک۔ ایک کمرہ تعمیر کرانے کا وعدہ کیا۔ ایک کمرہ کی تعمیر کی لاگت کا اندازہ بیس ہزار روپیہ ہے۔ فیصلہ کیا گیا کہ ان معطیان کے اسمائے گرامی مرمریں تختیوں پر کندہ کرا کر انہیں متعلقہ کمرہ کی دیوار میں نصب کیا جائے۔

(۱) ایک مخیّر قرآنی دوست جو اس طرح عطیہ دینا چاہتے ہیں کہ ایک ہاتھ دے اور دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ (ایک کمرہ)

(۲) ایک اور اسی قسم کے دوست جو اپنے احباب کے تعاون سے ایک کمرہ تعمیر کرانے کا وعدہ کرتے ہیں۔

(۳) محترم راجہ محمد اکرم صاحب (ایڈوکیٹ۔ لاہور) رکن مجلسِ منتظمہ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔

(۴) محترم محمد اقبال سرور صاحب (میسرز شاہ محمد اینڈ سنز۔ ملتان) بطور ذاتی عطیہ۔

(۵) بزمِ طلوعِ اسلام کراچی (حسبِ اعلان نمائندہ بزم محترم محمد اسلام صاحب)

(۶) بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی (حسبِ اعلان نمائندہ بزم۔ محترم نذیر حسین عارف صاحب)

(۷) بزمِ طلوعِ اسلام لاہور (حسبِ اعلان نمائندہ بزم محترم میرزا محمد خلیل صاحب)

(علاوہ ازیں مختلف بزموں کے نمائندگان نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی بزموں کو کمروں کی تعمیر کے لئے آمادہ کریں گے اور آئندہ کنونشن میں اس کی بابت اعلانات کر دیئے جائیں گے)۔

۲۔ عطیّات

(۱) محترم غلام محی الدین صاحب (لاہور)۔ نصف مربع اراضی واقعہ ڈیرہ غازی خان۔

(۲) محترم میاں مقصود علی صاحب (لاہور)۔ دس ہزار روپیہ۔ (پانچ مساوی اقساط میں)

(۳) محترم ڈاکٹر محمد صادق صاحب (میاں چنوں) پانچ ہزار روپیہ۔ (یک مشت)

(۴) محترم عبدالمجید قریشی صاحب (لاہور) اڑھائی ہزار روپیہ۔ (یک مشت)

(۵) محترم چوہدری لال خان صاحب (موضع اعدیاں ضلع شیخوپورہ) ایک ہزار روپیہ سالانہ۔ چار سال تک کیلئے۔

(۶) محترم سلطان احمد صاحب۔ (چونیاں) ایک ہزار روپیہ سالانہ۔ تین سال تک کے لیے۔

(۷) میاں حمید چراغ میانہ صاحب (میانوالی)۔ چار سو روپیہ سالانہ۔ تاحین حیات۔

(۸) چوہدری محمد دین صاحب (سیالکوٹ) دو سو روپیہ سالانہ۔ دس سال تک کے لئے۔

(۹) محترم میجر محمد یوسف ڈار صاحب (چھاؤنی لاہور)۔ پچاس روپیہ ماہوار۔ تاحین حیات۔

(۱۰) محترم محمد اشرف۔ محمد سعید (برادران۔ لاہور) پچاس روپیہ ماہوار۔ تاحین حیات۔

(علاوہ بریں مختلف احباب نے فنڈ اکٹھا کرنے کے لئے تجاویز بھی پیش کیں اور خدمات بھی)

(۷) یہ وعدے اور عطیات بڑے حوصلہ افزا ہیں لیکن ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جب کالج کی تجویز پہلے پہل سامنے لائی گئی تھی تو بہت سے احباب نے وعدے کئے تھے کہ جب اس کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہونے لگے گا تو ہم اسی قسم کے عطیات پیش کریں گے۔ ہم ان تمام احباب کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنے وعدوں کا ایفا کریں۔

علاوہ ازیں ہم ملک کے ان تمام ارباب ثروت وہمت سے جو اس قسم کی درسگاہ کے قیام کے حق میں ہیں، خصوصی درخواست کریں گے کہ وہ از خود آگے بڑھیں اور زیادہ سے زیادہ امداد سے اس اسکیم کو کامیاب بنائیں۔

جو احباب اس عظیم مقصد کے لئے فنڈ اکٹھا کرنے کا عزم رکھتے ہوں، وہ اپنے ارادے سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ ہم انکی خدمت میں تفصیلاً عرض کریں گے کہ اس سلسلہ میں انہیں کیا کرنا چاہیئے۔

اور جو احباب اس سلسلہ میں کوئی مفید مشورہ دینا چاہیں، اس پر بصد شکر غور کیا جائے گا۔ واضح ہے کہ حکومت پاکستان نے اس کی منظوری دے دی ہے کہ جو عطیات اس مقصد کے لئے دیئے جائیں گے وہ انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

۸۔ سوسائٹی کا حساب بینک میں کھول دیا گیا ہے اور جملہ رقوم اس میں جمع کی جاتی ہیں۔ عطیات اس پتہ پر بھیجے جائیں۔

میرزا محمد خلیل صاحب۔ خزانچی قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

چیک اس نام سے کاٹے جائیں اور کراس کر کے بھیجے جائیں۔

QURANIC EDUCATION SOCIETY

(REGD.)

اور بینک ڈرافٹ — حبیب بینک۔ گلبرگ۔ لاہور — کے نام لکھے جائیں۔

(۹) آخر میں اسے پھر دہرا دوں کہ جب یہ تعلیمی اسکیم عمل میں آگئی — اور جب آپ ہمت کریں گے تو یہ عمل میں کیوں نہیں آئے گی — تو اس سے ہماری قوم ایک نیا موڑ مڑ جائے گی۔ اس سے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل جائے گا۔ اور اس میں حصہ لینے والے — السابقون الاولون — کا نام زمانے کے صفحات پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا جس طرح سرسید کا دارالعلوم حصولِ پاکستان پر منتج ہوا، چہ عجب کہ یہ نئی درسگاہ، پاکستان کو ایک صحیح قرآنی مملکت میں تبدیل کرنے کا موجب بن جائے۔ کتنی حسین ہے ہماری یہ آرزو۔ اور کیا درخشندہ ہے اس کا مستقبل — واللہ المستعان۔ علیہ توکلت۔ والیہ انیب۔

والسلام۔ نیاز آگیں

(شیخ سراج الحق)

سیکرٹری۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

—— (۲) ——

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں
ہر اتوار کی صبح آٹھ بجے
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

کراچی میں
ہر اتوار کی صبح ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ)
سیمنار ہال۔ سندھ اسمبلی بلڈنگ

لائلپور میں
ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزم طلوعِ اسلام، راجہ چوک ریل بازار

کوئٹہ میں
ہر اتوار سہ پہر (بذریعہ ٹیپ)
المیزان بلڈنگ۔ کمرہ ۱۱

لاہور سے ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات اور دیگر نامور مصنفین کی تصنیفات
ملنے کا پتہ
مکتبہ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

شاہد عادل

جماعتِ اسلامی کے ذیلی ادارے

ہندو رام لیلا کے تہوار پر راون کی مورتی بنایا کرتے تھے۔ بہت بڑا دیو قامت، لحیم و شحیم مجسمہ جس کا سر تو ایک ہی ہوتا تھا لیکن چہرے دس۔ چہرے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے لیکن بات ہر ایک وہی کرتا تھا جو سر سے نکلتی تھی۔ وہ لیلائیں یہاں سے چلی گئیں لیکن راون کا مجسمہ یہاں موجود ہے۔ اسے عرفِ عام میں جماعتِ اسلامی کہا جاتا ہے۔ اس کا سر تو ایک ہی ہے لیکن اس کے متعدد چہرے ملک میں پھیلے ہوتے ہیں اور اس طرح نقاب پوش کہ سطحی نگاہیں بھانپ تک نہیں سکتیں کہ یہ اسی ایک مجسمہ کے مختلف روپ ہیں۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب سر سے نکلی ہوئی آواز، ان لاؤڈ اسپیکروں سے ساری فضا میں گونج اٹھتی ہے۔ آج کی نشست میں ہم ان مختلف چہروں کی نقاب کشائی کرنا چاہتے ہیں تاکہ عوام کو جس فریب میں رکھا جا رہا ہے، اس کی پردہ دری ہو سکے۔

لیکن اس نقاب کشائی تک پہنچنے سے پہلے ہم تمہیداً دو ایک باتیں بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے، چہروں سے پہلے، خود اس سر کی ایک حد تک نقاب کشائی ہو جائے گی۔

(۰)

برصغیر پاک و ہند میں تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ ہندو اپنی جماعت کانگریس کا دامن تھامے اکھنڈ بھارت کے لئے کوشاں تھے اور مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ خطۂ زمین یعنی پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک اور جماعت "اسلام" کا نعرہ لگاتی ہوئی منظرِ شہود پر آئی۔ اس کا نام جماعتِ اسلامی تھا اور اس کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تھے۔ حالانکہ اُس وقت کی سیاسی صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے غیر جانبدار سیاستدانوں تک نے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ اس نازک وقت میں جب کہ تمام مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں مسلمانوں کی کسی نئی جماعت کی تشکیل ان کے مقاصد کیلئے

نقصان وہ اور ہندوؤں کے مفاد میں ہوگی۔ علاوہ بریں، خود مودودی صاحب، اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے یہ اعلان فرما چکے تھے کہ مسلمانوں میں کسی الگ پارٹی کی تشکیل قطعاً اسلام کے خلاف ہے کیونکہ پوری امت مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آگیا اور اپنے علیحدہ وجود کا جواز پیش کرنے کے لئے اس نے اپنا مقصد یہ بیان کیا کہ وہ برصغیر میں اسلامی نظام حکومت قائم کریگی۔

ملّی زندگی کا نازک دور

ہم پھر دہرا دیں کہ یہ دور مسلمانانِ ہند کے لئے بڑا ہی نازک تھا۔ ہندو، انگریزوں کے ساتھ مل کر دن رات اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ پاکستان کسی طرح بھی وجود میں نہ آسکے۔ جماعت اسلامی کی تشکیل کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ مسلمانوں کے اس نازک دور کا نازک ترین لمحہ آن پہنچا۔ یہ نازک ترین لمحہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات تھے جو پاکستان کے قیام کیلئے فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ انتخابات کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان پاکستان بنانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ نیشنلسٹ علماء اور دیگر سیاستدان پہلے ہی اس مطالبہ کی مخالفت کر رہے تھے۔ اگر اس وقت مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو جاتا، اور ایک مزید طبقہ اس مطالبہ کے خلاف ووٹ دیتا، یا غیر جانبدار رہ کر بیٹھ جاتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ ہم سب ہندوؤں کے غلام ہوتے۔ وقت کی یہی نزاکت اور معاملہ کی اہمیت تھی جس کے پیش نظر بانیٔ پاکستان کیطرف سے تمام مخالف و موافق مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ تشکیل پاکستان کے حق میں ووٹ دیں۔ لیکن جہاں مسلمانوں کی اکثریت نے عملی تعاون کا مظاہرہ کیا وہاں مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے یہ روکھا سا جواب دیا۔

"..... ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔"

(ترجمان القرآن۔ جلد ۲۷ عدد ۳، ۴ بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۶ء صفحہ ۱۸۹)

لیکن جب ان حضرات کی مشئوم تمناؤں اور مذموم کوششوں کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا تو مودودی صاحب اپنے لاؤ لشکر سمیت پہلے ہی تافلوں کے ساتھ پاکستان تشریف لے آئے۔ اور جو مقصد وہاں حاصل نہیں کر سکے تھے، اس کے حصول کے لئے یہاں مصروفِ سعی و عمل ہو گئے۔ مثلاً

مسئلہ کشمیر اور جماعت اسلامی

اس نوزائیدہ مملکت نے ابھی پوری طرح سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ہندوستان نے کشمیر پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے

حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر اپنی جانوں کی قربانی پیش کی۔ جماعتِ اسلامی کا اس جہاد میں شریک ہونا تو دور کی بات تھی الٹا مودودی صاحب نے اس کے ناجائز ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ مودودی صاحب کی مسئلہ کشمیر میں یہ دخل اندازی کتنے خطرناک نتائج کی حامل تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خود جماعتِ اسلامی ابھی تک اس غلط فتوے کی تاویلات کے چکروں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی جو تاویل بھی کی جاتی ہے اصل حقیقت اس میں سے اپنا سر باہر نکال لیتی ہے۔ یہاں تک کہ خود تاویلات سے اصل فتوے کا مضمون سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس قسم کی صرف ایک تاویل پیش کرتے ہیں جس سے فتوے اور سارا مسئلہ واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

فتویٰ نہیں بلکہ فقہی رائے تھی

مولانا کے فتویٰ پر عوام اور علمائے دین نے جب سخت غم و غصے کا اظہار کرنا شروع کر دیا تو اس پر غور کرنے کے لئے جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا۔ مجلس نے پہلی وضاحت یہ فرمائی کہ

"یہ کوئی فتویٰ نہیں تھا بلکہ امیر جماعت اسلامی کی فقہی رائے تھی"

(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۴۸ء صفحہ ۳۲۸)

سبحان اللہ! کیسی ابلہ فریب تاویل ہے۔ کم از کم ہم جیسے کم علموں پر تو ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا کہ فتویٰ اور فقہی رائے میں کونسا امتیازی فرق ہے؟ بہرحال یہ فتویٰ تھا یا فقہی رائے، جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے اس کی تاویل یوں کی:۔

"امیر جماعت نے اپنے پچھلے بیانات میں جو شرعی مسئلہ بیان کیا تھا وہ اس حالت سے متعلق تھا جب کہ سرکاری طور پر اس امر کا کوئی اقرار و اظہار نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی فوجیں حدودِ کشمیر میں موجود ہیں۔ اب ۷ ستمبر کو مجلسِ اقوامِ متحدہ کے کشمیر کمیشن سے حکومتِ پاکستان کی جو مراسلت شائع ہوئی ہے، اور وزیر خارجہ پاکستان نے ۸ ستمبر کو جو بیان دیا ہے، اس میں اس امر واقعہ کا اظہار و اقرار موجود ہے اور حکومتِ ہند بھی اس پر مطلع ہو چکی ہے، لہٰذا اب چونکہ معاملہ کی نوعیت بدل گئی ہے اور اس بنا پر اس کا شرعی حکم بھی وہ نہیں ہو گا جو پہلے تھا۔ اس لئے مجلسِ شوریٰ کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اب معاہدانہ تعلقات کے باوجود اہلِ پاکستان کے لئے جہادِ کشمیر میں جنگی حصہ لینا بالکل جائز ہے" (ایضاً)

اب "بالکل جائز" کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ یعنی پہلے یہ ناجائز تھا اور جو مسلمان اس مقصد کے لئے جانیں کٹوا چکے تھے ان کے نہ درجۂ شہادت نصیب ہوا تو گویا سرے سے ان کی موت ...... تھی۔

جماعتِ اسلامی کی ساری تاریخ اس کی اسی پالیسی کا عبرت آمیز مرقع ہے۔ وہ انتہائی نازک وقت میں، پاکستان کی پشت میں خنجر گھونپتی ہے اور اس کے بعد لہولہان دستانہ اتار کر، وہی ہاتھ مصافحہ کے لئے آگے بڑھاتی ہے اور جب ہاتھ آگے بڑھاتی ہے تو راون کے دسوں چہرے اسی سُر اور لے میں الاپ شروع کر دیتے ہیں۔ دنیا سمجھتی ہے کہ اس جماعت کی تائید ملک کے مختلف گوشوں سے ہو رہی ہے حالانکہ مائیک پر مقرر ایک ہی ہوتا ہے جس کی آواز ان لاؤڈ اسپیکروں سے فضا میں شور برپا کر دیتی ہے۔ یہ لاؤڈ اسپیکرز اس جماعت کے ذیلی ادارے ہیں جن کے نام مختلف رکھے گئے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کا پہلا ذیلی ادارہ

اس جماعت کا پہلا ذیلی ادارہ "مکتبۂ جماعتِ اسلامی" تھا جس کے ذمے جماعت کے لٹریچر کی اشاعت تھی۔ یہ ادارہ قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد جماعتِ اسلامی کے لئے مختلف قسم کی خدمات سرانجام دیتا رہا لیکن "حکمتِ عملی کی پالیسی" کے بعد (جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا) جب جماعت نے لوگوں کی نفرت کو محسوس کیا تو اس ادارے کا نام بدل کر "اسلامک پبلیکیشنز" رکھ دیا گیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس نام میں جماعتِ اسلامی کا شائبہ تک بھی محسوس نہیں ہونے پاتا۔ حتیٰ کہ نام کی زبان تک بھی قومی نہیں، افرنگی ہے۔

دوسرا ذیلی ادارہ دار العروبۃ

اسی دوران اراکینِ جماعت کی طرف سے مختلف حلقوں میں کام کرنے کے لئے مختلف قسم کے ذیلی اداروں کے قیام کی تجاویز پیش ہوئیں۔ لیکن عامۃ الناس میں جوش و خروش سے تحریکِ پاکستان کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے، انہیں ایسا کوئی ادارہ قائم کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ یہ تجاویز ممکن نظر نہ آئیں تو جماعت نے عرب ممالک میں کام کرنے کے لئے اپنا مشہور ذیلی ادارہ "دار العروبۃ" کی بنیاد رکھ دی۔ اس ادارہ کا مقصد تو یہ بتایا گیا تھا کہ اس کے ذریعے برصغیر کی اسلامی تحریکوں کا دیارِ عرب میں تعارف کرایا جائے گا اور وہاں کی اسلامی تحریکوں سے برصغیر کے مسلمانوں کو روشناس کرایا جائے گا۔ لیکن اس ادارے نے عرب ممالک میں تحریکِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان کا جس مذموم طریقے سے تعارف کرایا، اس کی تفصیلات "طلوعِ اسلام" بابت مارچ ۱۹۶۹ء میں بیان ہو چکی ہیں۔ اس قسم کے مذموم تعارفوں سے ہمارے دشمنوں نے عربوں کے دلوں میں غلط شبہات پیدا کر کے جو فائدہ اٹھایا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ابھی تک بعض عرب ممالک کے ساتھ ہمارے روابط خوشگوار سطح تک نہیں پہنچ سکے۔

اسلامی جمعیتِ طلبہ

جماعت کو کام کرنے کا اصل موقع قیامِ پاکستان کے بعد ہی ملا۔ جماعت نے طلبہ اور مزدوروں میں کام کرنے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا

چنانچہ فوراً ہی دو ذیلی ادارے قائم کر دیئے گئے۔ ایک طلبا کو اپنے زیرِ اثر لانے کے لئے "اسلامی جمعیت طلبہ" کے نام سے اور دوسرا مزدوروں میں کام کرنے کے لئے۔ اسلامی جمعیت طلبہ نے تھوڑے ہی عرصہ میں خاصی کامیابی حاصل کر لی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ نوجوان طلباء کے لئے اسلامی نعروں میں ایک خاص کشش تھی اور دوسری وجہ جماعت سے متاثر اساتذہ کی کوششیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب بھی اس ادارے کی کامیابیوں کو گہری نظر سے دیکھا جائے گا تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس کامیابی میں طلبا کی نسبت اساتذہ کا حصہ زیادہ ہے۔ ان اساتذہ کی تیاری میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات سے (جس کے ہیڈ اس یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب تھے) خاصا فائدہ اٹھایا گیا۔ یہ اساتذہ اسلامیات میں ایم۔ اے کرنے کے بعد مختلف کالجوں میں اسلامیات کے پروفیسروں کی حیثیت سے گھس جاتے اور اس طرح وہاں جماعتِ اسلامی کا نقاب پوش ([illegible]) بن جاتے ہیں۔

ادارہ معیشت اسلامی

جماعت کی طرف سے مزدوروں میں کام کرنے کے لئے ادارہ معیشت اسلامی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ کٹھن کام ایک فاضل رکن جناب عبدالحمید صاحب قریشی بی۔ اے کے سپرد ہوا۔ بیچارے ناظم نے تو اپنا رات دن ایک کر دیا لیکن کسی قسم کی کامیابی تو درکنار، جماعت مزدوروں میں اپنا کوئی معمولی سا حلقۂ اثر بھی قائم نہ کر سکی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جو جماعت سرمایہ داروں کی حمایت کے لئے مصروفِ کار ہو وہ مزدوروں کے مفاد کا تحفظ کیا کر سکتی ہے۔ اس نے تو مزدوروں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے جو پہلا قدم اٹھایا وہی ان کی اپنی سرمایہ دارانہ حیثیت کا غماز تھا۔ انہوں نے مزدوروں میں تقسیم کے لئے جو پہلا پمفلٹ شائع کیا وہ آرٹ پیپر پر ٹائپ میں اس خوبصورتی سے چھاپا گیا تھا کہ جماعتِ اسلامی کا دوسرا لٹریچر اس کے سامنے ماند پڑتا تھا۔ اسی ایک "حکمتِ عملی" کے خلاف اقدام سے بلی تھیلے سے باہر آگئی۔

حال ہی میں پاکستان میں مزدوروں کی ایک نئی پارٹی تشکیل ہوئی ہے۔ اس پارٹی کو "خلافِ اسلام" قرار دے کر ایک "اسلامی لیبر پارٹی" کا اعلان اخبارات میں شائع ہو گیا ہے ——— اب پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

حکمتِ عملی کی پالیسی

یہ تو تھے وہ ادارے جو "حکمتِ عملی" کی پالیسی سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔ اس پالیسی کے وضع ہونے کے بعد پھر مزید ذیلی اداروں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے دیکھئے کہ یہ حکمتِ عملی کی پالیسی کیا بلا تھی۔ جماعتِ اسلامی نے جس طرح پاکستان کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا، اب جماعت پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ وہ دنیا کے سامنے جو "اسلامی نظریہ" اور "اصول" پیش کرتے رہے

ہیں خود ان کے لئے ان پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ اس بارے میں ان کے ایک سنہری اصول کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یعنی وہ اصول جس کا واسطہ انہوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ نہ دینے کے بارے میں دیا تھا۔ کہ جب تک اسلامی نظام حکومت قائم نہیں ہوتا وہ کسی طرف دھیان نہیں دے سکتے۔ چنانچہ اس مشکل کا حل حکمت عملی کی پالیسی میں ڈھونڈ لیا گیا۔ بہتر ہوگا کہ اسے خود امیر جماعت اسلامی کے الفاظ ہی میں پیش کر دیا جائے۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، اور جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی سے جما رہے۔ مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جب ہی تو کبھی نہیں چل سکتی۔ یہاں نصب العین تک پہنچنے کا انحصار ایک طرف ان ذرائع پر ہے جو کام کرنے والے کو بہم پہنچیں۔ دوسری طرف ان مواقع پر ہے جو اسے کام کرنے کے لئے حاصل ہوں۔ اور تیسری طرف موافق و ناموافق حالات کے اس گھٹنے بڑھنے تناسب پر ہے جس سے مختلف مراحل میں اسے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں مشکل ہی سے کسی کو بالکل سازگار ملتی ہیں بالخصوص اہل حق کو تو یہ کبھی سازگار نہیں ملی ہیں اور نہ آج ملنے کے کوئی آثار ہیں۔ اس صورت حال میں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی پر رکھوں گا اور پھر دوران میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثنا اور لچک کی گنجائش بھی نہیں رکھوں گا وہ عملاً اس مقصد کے لئے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمت عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے راستے کی کن چیزوں کو راستے کی پیشقدمی کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصد کی اہمیت دینی چاہیئے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسب ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیئے۔"

(ترجمان القرآن، بابت دسمبر ۱۹۴۴ء۔ بحوالہ ہفت روزہ المنبر لائلپور، بابت ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ)

حکمت عملی کی پالیسی کا ردعمل

جماعت کے اہل علم حضرات کی اکثریت نے جو جماعت میں السابقون الاولون کی حیثیت رکھتے تھے، اس پالیسی کے خلاف سخت ردعمل

---

[1] تحریک پاکستان کی مخالفت کے زمانے میں، مودودی صاحب پر یہ راز منکشف نہیں ہوا تھا۔

(طلوع اسلام)

کا مظاہرہ کیا اور جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ اس طرح کارکنوں کی ایک بھاری تعداد کے چلے جانے کی وجہ سے جماعت کے نظام کو سخت دھچکا لگا۔ لیکن اس وقت تک امیر جماعت جدید تعلیمیافتہ نوجوانوں کی ایک خاص تعداد کو اپنا حاشیہ نشین بنا چکے تھے۔ اور یہی لوگ اس شکل وقت میں جماعت کا سہارا ثابت ہوئے۔ لیکن اس

جماعت کے وقار میں کمی

کے باوجود جماعت کے معتدد حضرات کی اتنی بڑی تعداد کی علیحدگی سے جماعت کے وقار کو بڑا سخت دھچکا لگا اور لوگ اس سے متنفر ہو گئے۔ بلکہ یہاں تک بھی دیکھا گیا کہ جس کتاب پر "مکتبہ جماعت اسلامی" چھپا ہوتا، اس کا پڑھنا تو درکنار اسے ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا علاج نہایت ضروری تھا اور وہ علاج خود حکمتِ عملی تھا جس کا تقاضا یہ تھا کہ اب جماعت اسلامی کے بے حجابانہ نام سے کچھ کرنے کی بجائے نقاب پوش اداروں کو قائم کیا جائے۔ یعنی ایسے اداروں کو جن کا بظاہر جماعت اسلامی سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن وہ کام جماعت اسلامی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے کریں۔ ان میں (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) سب سے پہلا ادارہ "اسلامک پبلیکیشنز" ہے جس نے "مکتبہ جماعت اسلامی" کی جگہ لی ہے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے حسب ذیل ادارے آتے ہیں۔

(۱) جمعیت اتحاد العلماء۔ پاکستان۔ لاہور

(۲) مجلس تحقیقات علمی۔ لاہور

(۳) ادارہ مطالعہ و تحقیق۔ لاہور

(۴) ادارہ معارف اسلامی۔ کراچی۔

(۵) عوامی اسلامی محاذ۔ پاکستان۔

اب ان اداروں کا تعارف ملاحظہ فرمایئے۔

جمعیت اتحاد العلماء

علماء کا طبقہ جماعت اسلامی کے "اسلامی نظریوں" کا شروع سے مخالف چلا آرہا تھا۔ حکمتِ عملی کی پالیسی کی وجہ سے جب جماعت کے علماء بھی اسے خیرباد کہہ کے چل دیئے تو علماء کو اپنی مخالفت کو اور زیادہ تیز کرنے کا موقع مل گیا۔ جماعت نے اس صورتِ حالات کیطرف اپنی اولین توجہ دی اور علماء کو اپنے زیرِ اثر لانے کا پروگرام بنایا۔ اس کام کی ابتداء یوں کی گئی کہ اس سے قبل علماء کے جن عیوب کی نشاندہی کر کے ان پر کڑی تنقید کی جاتی تھی۔ جماعت نے آہستہ آہستہ اس مسلک سے پیچھے ہٹنا شروع کیا پھر اس رجعتِ قہقری میں علماء کے ان عیوب کو ان کے ہنر قرار دینے لگی۔ مثلاً پہلے ان کے خیال کے مطابق علماء کے درسِ نظامی میں آٹے میں نمک برابر بھی دین نہ تھا لیکن اب وہ اسلامی علوم کا ٹھوس نصاب قرار دے دیا گیا۔ جن کی زبانوں میں ڈنک تھا انہیں یکایک انبیاء کے وارثوں کا مقام

عنایت کر دیا۔ یہ تفصیلات طول طویل ہیں اور ہم انہیں "جماعتِ اسلامی اور علماء" کے زیرِ عنوان "طلوعِ اسلام کی مئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں قارئین کے سامنے لا چکے ہیں۔ اس قسم کی فضا پیدا کرنے کے بعد "جمعیت اتحاد العلماء" کے نام سے ایک ذیلی ادارے کی داغ بیل ڈالی گئی اور مجلسِ شوریٰ کے ایک انتھک رکن، مولانا گلزار احمد مظاہری کو اس ادارے کا ناظم مقرر کیا گیا۔ جماعت کے رسائل و جرائد میں اس ادارے کی کارگزاریوں کا ذکر نظروں سے گزرتا رہتا تھا لیکن اس کی "شاندار ترقیوں" کا علم اس وقت ہوا جب جماعت کے ایک آرگن، "ہفت روزہ ایشیا" نے اس ذیلی ادارے کے بارے اپنی ایک خصوصی اشاعت پیش کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ پاکستان کے ۲۳۰۰ علماء اس ادارے کے رکن ہیں۔ یہ اعداد و شمار اگر حقیقی تھے تو اس ادارے کی ترقی واقعی قابلِ رشک تھی۔

اتحاد العلماء کی اسلامی خدمات

اس ترقی کو دیکھ کر راقم کے دل میں یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی کہ علماء کا اتنا بڑا ادارہ کون سی اسلامی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ لیکن حیرت کہ علماء کے اتنے بڑے ادارے کے دفتر کو تلاش کرنے میں ہمیں ایک عرصہ لگ گیا اور جب خوش قسمتی سے دفتر تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی تو اسے اکثر و بیشتر بند پایا۔ معلوم ہوا کہ ناظم صاحب بالعموم دورے پر رہتے ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں دفتر بند رہتا ہے۔ یعنی "اتنے بڑے" ادارے کا وجود صرف ایک شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ ادارے کے دفتر سے تو ہمیں اس کی "اسلامی خدمات" کی کوئی تفصیل نہ مل سکی لیکن ایک دن راہ چلتے ہماری یہ مشکل حل ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ عیدالاضحیٰ کی تقریب پر جماعتِ اسلامی کے جو کارکن قربانی کی کھالیں حاصل کرنے کے اشتہار لگا رہے تھے اس کے ساتھ ہی اس ذیلی ادارے کا بھی ایک عدد اشتہار چسپاں کیا جاتا تھا۔ اس اشتہار کے مندرجات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ اس ادارے کے نزدیک بھی "اسلامی خدمات" کا وہی طریقہ ہے جو جماعتِ اسلامی کا طرۂ امتیاز ہے۔ مثلاً ملک میں صحیح اسلامی نظامِ تعلیم رائج کرنے کے سلسلہ میں ادارہ کی طرف سے یہ مطالبہ فرمایا گیا تھا کہ "یونیورسٹی آرڈیننس کو منسوخ کیا جائے اور طلبا کے دوسرے مطالبات پورے کئے جائیں"۔ دیکھا آپ نے کہ یونیورسٹی آرڈیننس کی منسوخی سے ہمارا نظامِ تعلیم کس طرح اسلامی ہو جاتا ہے۔

علماء کے نزدیک اس ذیلی ادارہ کا مقام

راقم نے علماء کے اس اتنے بڑے ادارے کی اس روش کی ایک عالمِ دین سے شکایت کی تو انہوں نے غصے میں فرمایا کہ عجیب بات ہے کہ ہر ایرے غیرے کو عالمِ دین سمجھا جانے لگا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کا شمارہ بابت ۳۰ اگست ۱۹۶۸ء کا صفحہ نمبر ۳ کھول کر راقم کے سامنے

لاکر رکھ دیا۔ اور اس صفحے کا کالم نمبر تین پڑھنے کو کہا۔ اس کالم کی سرخی تھی "علماء کے نام کا غیر ذمہ دارانہ استعمال"۔ اور اس کے نیچے منجملہ اور باتوں کے لکھا تھا۔

"کچھ مقابلتہً "ہرا یرے غیرے" جاہل و نیم خواندہ افراد کے ہزاروں ناموں کی فہرست شائع کر کے یہ تاثر پھیلانا چاہا کہ علماء کی اتنی بڑی طاقت تو "یہ" ہے اور "یہ" ہمارے ساتھ ہے۔ مگر یہ فراڈ بھی ناکام ہوا۔ ان ناموں میں بعض فاضل اور جید علماء کے اسمائے گرامی بھی شائع کئے گئے تھے تاکہ عوام ان ناموں سے مرعوب ہو کر دھوکہ میں آجائیں۔ لیکن فوراً ہی ان علماء حق گو نے اپنی بے تعلقی اور بیزاری کا صاف صاف اعلان کر دیا۔"

اس اقتباس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

۲۔ مجلسِ تحقیقات علمی لاہور

یہ مجلس اتحاد العلماء ہی کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ اس کا تعارف ہفت روزہ ایشیا کے "اتحاد العلماء" نمبر ہی میں کرایا گیا تھا۔ اس مجلس کے تحقیقی کام کے بارے میں استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی تک کسی تحقیقی کام کی ابتدا نہیں ہو سکی۔ اس پر معاً ہمارے ذہن کے سامنے ترجمان اسلام کا مندرجہ بالا اقتباس آگیا کہ یہ سب فرضی کاروائیاں کم علم لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے ہیں۔

۳۔ ادارہ مطالعہ و تحقیق لاہور

اس ادارے کے بانی جماعت اسلامی کی مشہور شخصیت مولانا نعیم صدیقی صاحب ہیں۔ اور وہ خود ہی اس کے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ اس ادارے کا صدر دفتر ماہنامہ سیارہ۔ اچھرہ۔ لاہور میں ہے۔ اس ادارے کے کارناموں کی بابت جستجو کرنے پر ہمیں وہی تجربہ ہوا جو مجلس علمی لاہور کے سلسلے میں ہوا تھا۔

۴۔ ادارہ معارفِ اسلامی کراچی

حکمت عملی کی پالیسی کے بعد جماعت اسلامی نے جو ذیلی ادارے قائم کئے ہیں یہ ادارہ ان سب میں زیادہ فعال ہے۔ پہلے تو ہمیں اس ادارے کے بارے میں کوئی خاص علم نہیں تھا لیکن جب سے ماہنامہ "چراغ راہ" کو اس ادارہ کا خصوصی ترجمان قرار دے دیا گیا ہے تفصیلات معلوم ہونے لگی ہیں۔ اس ادارے کے چیئرمین امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہیں۔ ادارے کے افتتاح کے موقع پر انہوں نے اس کے جو مقاصد بیان کئے تھے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہیں۔

(۱) مغربی فکر و فلسفۂ حیات کا جو طلسم بندھا ہوا ہے اس کو توڑا جائے۔

(چراغ راہ۔ جون ۱۹۶۷ء صفحہ ۹)

(۲) اسلامی علوم وفنون کو نئے اسلوب اور نئے طریقے پر مرتب کیا جائے۔ (ایضاً صفحہ ۱۰)

(۳) اسلامی طریقۂ تعلیم کے مطابق نصاب مرتب کیا جائے۔ کیونکہ اس وقت تک اسلامی تعلیم کا نعرہ لگانے کے باوجود یہ کوشش نہیں کی گئی کہ ہماری یونیورسٹیوں میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں ان پر اسلامی نقطۂ نظر سے کتابیں تیار کی جائیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۲)

حق بات یہ ہے کہ یہ مقاصد ایسے بلند ہیں کہ مخالف سے مخالف بھی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے ان مقاصد کی تکمیل کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ہمیں تجسس ہوا۔ ادارہ کا قیام ۱۹۶۱ء میں عمل میں لایا گیا تھا اور اس کے قیام کے سات سال بعد چراغِ راہ کے فروری ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں اس کی کارگزاریوں کی کچھ تفصیل پیش کی گئی تھی۔ یہ کارگزاریاں زیادہ تر جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کو انگریزی زبان اور بنگالی زبان میں ترجمہ کرنے سے متعلق تھیں۔ ادارہ کی تاسیس کے بیان کردہ مقاصد کے لئے کام کرنے کا کہیں ذکر نہ تھا۔ ہمیں خیال ہوا کہ شاید سرسری مطالعہ کی وجہ سے ہمیں کہیں غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔ اس لئے ہم نے چراغ راہ کے دورِ نو کے پہلے سال کے شماروں کو اکٹھا کرکے بڑے غور سے مطالعہ کیا لیکن ہمیں اپنی مطلوبہ چیز تو نہ مل سکی، ہاں اس کوشش میں ہمیں ایک اور چیز کی جھلک نظر آئی۔ وہ جھلک مختلف رنگوں میں چین دشمنی تھی۔ اس جھلک کا ہلکا سا نظارہ قارئین بھی کرلیں:۔

(۱) چراغ راہ۔ بابت مارچ ۱۹۶۷ء کے صفحہ ۶۱ پر بھارت کے ایک نیم سرکاری رسالے کے ایک انگریزی مضمون بعنوان "تاشقند اور اسکے بعد" کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے مصنف کا نام نہیں دیا گیا بلکہ یہ حکومتِ ہند کی کوئی دستاویز معلوم ہوتی ہے۔ اس مضمون میں عوامی جمہوریہ چین کے خطرہ کو نمایاں کرکے مسئلہ کشمیر کو حکومتِ ہند کی شرائط و خواہشات کے مطابق حل کرنے کی تجویز ہے۔ (صفحہ ۶۳)

اس مضمون میں چین اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے۔ "پاکستان بظاہر چین نواز پالیسی پر عمل پیرا ہے لیکن مغربی ممالک سے اس کے تعلقات کی نوعیت اور رائے عامہ کے رجحانات اسے اس راستے میں ایک حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔" (ایضاً صفحہ ۶۲)

(۲) اپریل ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں ہندوستان کے ایک خلافِ چین ادارے کی جانب سے شائع کردہ چین کے خلاف ایک امریکی کتاب کے اردو ترجمے پر تائیدی تبصرہ کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۸۷) ہم نے پاکستان کے کسی اور اخبار یا رسالے میں اس کتاب پر تبصرہ نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں اسلامی تحقیق کے اس ادارے کے پاس یہ کتاب کہاں سے پہنچ گئی۔

(۳) مئی کے شمارے میں علمی افق کے تحت ایک مضمون کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے

"بھارتی کمیونسٹ پارٹی کی گروہ بندی" اس مضمون میں اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں چین کا کردار منافقانہ ہے۔ (صفحہ ۷۱)

(۴) پھر اسی علمی افق کے تحت ایک مضمون بعنوان "ہندوستان اور چین کے عزائم" شائع کیا گیا ہے جس میں آزاد کشمیر کا تعارف کچھ اس انداز سے کرایا گیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان ہی کا ایک علاقہ ہے۔ مضمون کا متعلقہ فقرہ یہ ہے "مغربی سیکٹر وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں بھارت، چین اور افغانستان کی سرحدیں ملتی ہیں"۔ ظاہر ہے کہ یہ سرحدیں آزاد کشمیر ہی میں ملتی ہیں۔

(۵) اکثر شماروں میں ایک امریکی پادری کی کتاب "ماؤزے تنگ کے دیس میں" کا اشتہار بار بار سامنے آیا۔ اس کا ترجمہ بھی جماعت ہی کے ایک اہل قلم کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

چراغِ راہ میں شروع ہی سے کمیونزم کے خلاف لکھا جاتا رہا ہے لیکن یہ حقیقت ہم پر منکشف نہ ہو سکی کہ ادارہ معارفِ اسلامی کا ترجمان بننے کے بعد اس مخالفت کا رُخ زیادہ تر چین کی طرف کیوں ہو گیا۔

بین الاقوامی شہرت

اس ادارے نے تھوڑے ہی عرصے میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے بیروت کے علمی حلقوں میں اس کا خاصا ذکر ہے۔ وہ لوگ اسے کراچی یونیورسٹی کا کوئی تحقیقی ادارہ سمجھتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ حال ہی میں بیروت سے اس ادارہ کے لئے دو لاکھ روپے کی کتابیں منگوائی گئی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ ان کتابوں کی قیمت بیرونی کرنسی ہی میں ادا کی گئی ہو گی۔

۵۔ عوامی اسلامی محاذ پاکستان

پچھلے دنوں جماعت کے حلقوں میں اس محاذ کا بڑا چرچا تھا۔ اس بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش میں ہمیں ایک پمفلٹ دستیاب ہوا جو جماعت کی مشہور شخصیت جناب نعیم صدیقی صاحب کے دستخطوں سے شائع ہوا ہے جس کے صفحہ ۸ پر تحریر ہے۔

"یہ تجویز وقت کی اہم ترین تجویز ہے کہ ایک ایسے عوامی محاذ کی تشکیل ہو جائے جس میں جدید طبقے کے سیاسی رہنما اور مخلص علماء ہم آہنگ ہو کر چلیں۔ حسب ذیل اصحاب کی ایک مجلسِ مشاورت جلد سے جلد اس تجویز کو زیرِ غور لا کر کوئی لائحہ عمل تیار کرے کے اسلام پسند جماعتوں اور افراد کو دعوت دیں۔ سردار شوکت حیات، میاں بشیر احمد، خواجہ محمد صفدر، خواجہ رفیق احمد، شیخ محمد اشرف ایڈووکیٹ، اصغر خان، جسٹس محبوب مرشد، مسٹر اے۔ کے بروہی۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، چودھری محمد علی، نواب زادہ نصر اللہ خان، مولانا محمد اکرم۔ پیر حسن الدین عباسی صاحب ایڈووکیٹ، ڈاکٹر جاوید اقبال، جسٹس کیکاؤس، مولانا گلزار احمد (اتحاد العلماء) مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا

عبدالنبی کوکب (جمعیت علمائے پاکستان) آغا شورش کاشمیری۔ چوہدری نذیر احمد خان۔"
محاذ کی اہمیت ناموں سے ظاہر ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ جماعتِ اسلامی کو اس بارے میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

غیر متعلق ادارے یہ تو تھے وہ ادارے جن کی کارروائیوں کا ذکر جماعتِ اسلامی کے رسائل و جرائد میں آتا رہتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ کئی ایسے ادارے بھی ہیں جن کا بظاہر جماعتِ اسلامی سے کوئی تعلق نہیں لیکن وہ جماعت کے لئے ظاہری ذیلی اداروں سے بھی زیادہ مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان لاتعلق اداروں میں سے چند کی جھلک ہمیں اس پروپیگنڈے میں نظر آتی ہے جو آجکل جماعتِ اسلامی نے سوشلزم کے خلاف شروع کر رکھا ہے۔

پروپیگنڈے کا نیا طریقہ طلباء میں کام کرنے کے لئے اگرچہ اسلامی جمعیت طلبہ موجود ہے لیکن سابقہ ایجی ٹیشن کے دوران اس جمعیت کے بعض کارکنوں سے کچھ ایسی حرکات سرزد ہوگئیں کہ اب وہ طلباء میں سوشلزم کے خلاف علی الاعلان پروپیگنڈہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس مقصد کے لئے ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ مختلف اداروں کی جانب سے (جن کا بظاہر جماعتِ اسلامی سے کوئی تعلق نہیں) اس موضوع پر پمفلٹ شائع کرائے گئے ہیں۔ یہ پمفلٹ اگرچہ اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف سے تقسیم کئے جا رہے ہیں لیکن اس ادارہ کا ان میں کہیں نام تک نہیں ہوتا۔ ان پمفلٹوں کو کچھ اس ترتیب سے تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) شروع میں ایک پمفلٹ "دعوتِ فکر و عمل" دیا جاتا ہے جس میں مختلف عنوانات پر قرآن مجید کی آیات جمع کی گئی ہیں اور ان کے نیچے اردو ترجمہ اور بس۔ یہ پمفلٹ "انجمن تعلیم و تنظیم" کے نام سے چھاپے گئے ہیں۔

(۲) پھر ایک دو دن کے وقفے کے بعد سفید کاغذ پر چھپی ہوئی ایک ۴۰ صفحات کی خوبصورت سی کتاب مفت عنایت کی جاتی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے "روسی ترکستان میں اسلامی سوشلزم" اس کے مصنف کے طور پر عبدالکریم عابد کا نام دیا ہوا ہے۔ اور اس کے ناشر ہیں نور احمد۔ ناظم دعوت الحق کراچی۔

(۳) پھر کچھ وقفے کے بعد ایک اور ۲۴ صفحات کا خوبصورت سا کتابچہ قارئین کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس کتابچہ کا عنوان ہے "عملی جہاد سے قلبی جہاد تک" اور اس کے مصنف مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں۔ یہ کتابچہ بھی عمدہ کاغذ پر ہیرا ڈائنر بک سٹال شمبو ناتھ روڈ کراچی کی طرف سے مفت تقسیم کے لئے شائع کیا گیا ہے۔ اس کتابچہ میں امیر جماعتِ اسلامی کی وہ تقاریر ہیں جو انہوں نے ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کے پاکستان

پر حملہ آور ہونے کے بعد کی تھیں۔ اس پمفلٹ کی اہمیت کیا ہے؟ اسے ذرا غور سے سنیئے۔

ہم شروع میں، مسئلہ کشمیر کے بارے میں امیر جماعت اسلامی کے ایک فتوے کا ذکر کر آئے ہیں اور جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی طرف سے اسکی جو تاویل کی گئی تھی اسے بھی نقل کر آئے ہیں۔ اس فتوے یا مجلس شوریٰ کی زبان میں "فقہی رائے" نے اہل پاکستان کے دلوں پر کچھ ایسا گہرا زخم لگایا تھا کہ وہ کسی طرح مندمل ہونے میں نہیں آتا۔ اور جب بھی جماعت کے اراکین کی طرف سے کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد ہو جاتی ہے تو یہ زخم پھر تازہ ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں طلباء کے ایجیٹیشن میں اسلامی جمعیت طلبہ کے پرجوش کارکنوں کے بعض کارناموں کی وجہ سے یہ زخم ایک دفعہ پھر ہرا ہو گیا۔ اب اس پمفلٹ میں مولانا مودودی صاحب نے یہ اعلان کیا ہے کہ پاکستان دارالاسلام ہے اور اس کے کسی حصے پر دشمن کے حملے سے جہاد فرض ہو جاتا ہے (صفحہ ۸)۔ معلوم نہیں مودودی صاحب کا یہ "فتوے" ہے یا "فقہی رائے"۔ لیکن جو بھی ہو مقصد اس سے یہی ہے کہ جہاد کشمیر کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے مسلمانوں کے قلب میں جو خنجر گھونپا تھا اس کا ازالہ ہو جائے۔ یہ پمفلٹ اگر جماعت اسلامی یا اس کے کسی ذیلی ادارے کی جانب سے شائع ہوتا تو اتنا مفید ثابت نہ ہوتا جتنا وہ جماعت اسلامی سے ایک لاتعلق ادارے کی جانب سے شائع ہو کر کام کر رہا ہے۔

(۴) اس سلسلے کے چوتھے پمفلٹ کا عنوان ہے "سوشلزم اور طلبا"۔ اس کے مصنف کے طور پر ایک طالب علم فاروق حسن گیلانی کا نام دیا ہوا ہے اور اس کا تعارف امیر جماعت اسلامی حلقہ سرگودہا جناب اسعد گیلانی کے قلم سے ہے۔ اس پمفلٹ پر ایک نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کس کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔

تعلیمی اداروں میں یہ پمفلٹ جماعت اسلامی سے متاثر اساتذہ کی اعانت سے تقسیم ہو رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کی جانب سے یہ شور مچایا جا رہا ہے کہ جو اساتذہ سوشلزم کا نام لیں انہیں فوراً تعلیمی اداروں سے نکال دیا جائے۔ اس واویلا سے ان کا مقصد یہ ہے کہ جماعت کے مفاد کے لئے کام کرنے والے اساتذہ کی طرف انگلی نہ اٹھائی جائے۔ جو ایسا کرے اس پر فوراً سوشلزم کے حامی ہونے کا الزام لگا دیا جائے۔

اسلامیات کا نصاب اور اعلیٰ تعلیم

بادی النظر میں یہ سرخی اس مضمون سے کچھ غیر متعلق سی نظر آئے گی۔ لیکن اس کی تفصیلات سامنے آ جانے کے بعد واضح ہو جائے گا کہ یہ کس طرح جماعت اسلامی کے لئے ایک مفید ادارے کا کام دے رہا ہے۔ ملک کے تعلیمی اداروں میں اسلامیات کا جو نصاب رائج ہے، اس کی افادیت کے بارے میں ہم سے نہیں، اس

مضمون پر سب سے بلند اتھارٹی یعنی پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سابق صدر اور اس کے موجودہ وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی صاحب کی زبانی سنیئے۔ انہوں نے لکھا تھا۔

علوم اسلامیہ یا اسلامیات کی تعلیم کے موجودہ نظام پر ایک نظر ڈالنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تبے مقصد، بے اثر اور فضول نقش ہے۔ عوام کی ضرورت پوری کرنے اور دائرہ مذہب میں تعمیری لیڈرشپ پیدا کر سکنے کے بجائے اس اسلامیات سے عامۃ الناس سے کہ ذہنی افراتفری کا شکار ہو رہے ہیں۔ اسے محض عوام کے جذبات کے لئے برقرار رکھا جا رہا ہے۔

(روزنامہ پاکستان ٹائمز راولپنڈی۔ صفحہ ۴۔ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۶۷ء)

لیکن یہ نصاب بے مقصد ہو گا کسی اور نقطۂ نگاہ سے۔ جماعت اسلامی کے پیش نظر مقاصد کے لئے تو یہ بہت مفید تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس نصاب میں اپنے نظریات و مقاصد داخل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں اس کے نصابیہ کی تشکیل میں اس قدر اثر حاصل ہے کہ وہ قرآن مجید تک کے نصاب کو خارج کرا کر اپنی کتابیں شامل نصاب کرا لیتے ہیں۔ مثلاً بی۔ اے کے موجودہ نصاب میں قرآن مجید کے نصف نصاب کو گھٹا کر انکی ایک کتاب "اسلامی نظریۂ حیات" داخل نصاب کر لی گئی ہے۔ یہ کتاب جماعت اسلامی کی ایک اہم شخصیت کی مرتب کردہ ہے اور اس میں اس جماعت کے لٹریچر کا خلاصہ بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے (طلوع اسلام میں اس کتاب پر تبصرہ گذر چکا ہے) اگر قرآن مجید کے نصاب کو اس طرح گھٹا کر کسی غیر جماعت اسلامی اہل علم کی کتاب داخل نصاب ہوتی تو جماعت کیطرف سے آسمان سر پر اٹھا لیا جاتا۔ لیکن چونکہ "اپنا" تھا اسلئے کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوئی۔

اس کے بعد ایم۔ اے اسلامیات کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے نصاب میں اگرچہ نام تو دوسری کتابوں کے دیئے گئے ہیں لیکن اسکی تشکیل کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ اس امتحان کی تیاری کے لئے زیادہ تر جماعت اسلامی ہی کے لٹریچر سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ جس صاحب کو ہمارے اخذ کردہ نتیجہ سے اختلاف ہو، وہ اپنے کسی قریبی ایم۔ اے اسلامیات کے طالب علم کی کتابوں پر ایک نظر ڈال کر اپنی تسلی کر سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایم۔ اے اسلامیات کے لئے عربی زبان جاننے کی بھی شرط نہیں۔ یہ شرط اڑوائی ہی اسلئے گئی ہے کہ اگر عربی کتب داخل نصاب ہوتیں تو جماعت اسلامی کے لئے مضر ہوتا۔

پراپیگنڈہ کے وسائل

مودودی صاحب کے متعلق ایک بات آپ نے، دوست دشمن سب کی زبان سے اکثر سنی ہوگی اور وہ یہ کہ مخالفین، مودودی صاحب کیخلاف جو کچھ جی میں آئے کہیں، یہ ان کے خلاف کبھی لب کشائی نہیں کرتے۔ یہ ان کی سطح پر کبھی نہیں اترتے ــــ

ظاہر ہے کہ یہ انسانی کیریکٹر کی بہت بڑی بلندی ہے کہ وہ مقابلہ کے لئے دشمن کی سطح پر نہ اُترے ۔ اپنے بلند مقام پر فائز رہے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مودودی صاحب کا ایک ہی پرچہ (ترجمان القرآن) ہے آپ دیکھئے ۔ اس میں مودودی صاحب نے کبھی اپنے بدترین دشمن کا بھی نام تک نہیں لیا ۔ یہ سچ ہے۔ ترجمان القرآن میں ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن مودودی صاحب کو خود ایسا کرنے کی ضرورت کیا ہے جب اس کام کے لئے انہوں نے بہت سے کارندے پال رکھے ہیں۔ یہ وہ رسائل اور اخبارات ہیں جن کا بظاہر جماعت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں، لیکن درحقیقت وہ سب انہی کی غلام گردشوں میں پھرنے والے ہیں۔ وہ ان کی شان میں اس طرح قصائد لکھتے ہیں کہ نوابوں اور مہاراجوں کے مصاحبوں کے قصے ماند پڑ جاتے ہیں ۔ وہ ان کے مخالفین پر وہ گند اچھالتے ہیں کہ شریف آدمی کو پگڑی سنبھالنی مشکل ہو جاتی ہے ۔ وہ یہ سب کچھ کرتے رہتے ہیں اور مودودی صاحب' شرافت و نجابت کا مجسمہ بنے اپنی مسندِ بلند پر براجمان تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری میں ہوتا ہی یہ ہے۔ سرمایہ دار خود سامنے نہیں آتا ۔ اس کے گماشتے سامنے آتے ہیں۔

لیکن اس سے وقتی فروغ تو حاصل ہو سکتا ہے حقیقی کامیابی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی ۔ اس لئے کہ قرآن مجید کا فیصلہ یہ ہے کہ لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ (۲۰/۶۹) "ڈگڈگی بجانے والا مداری کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا خواہ وہ کسی بھیس میں اور کسی جانب سے بھی کیوں نہ آئے۔"

(۲)

بقیہ "اپنے بزرگوں کی باتیں سنئیے" ص۲۲ سے آگے

سے گذرا ۔ ان میں سے ایک شخص نے اس کو چھیڑنے کے ارادے سے کہا ۔ میری بہن! کیسے رات گذری؟ مخنث نے کہا ۔ واللہ تیری بہن کی رات اس طرح گذری کہ ـــــ (اس کے بعد رات کی مخنث کاری کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اسے ہم کسی طرح بھی نقل کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ طلوعِ اسلام) ـــــ وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور لوگوں نے دونوں کا مذاق اڑایا۔" (ص۲۶)

اس قسم کے سات سو نوادرات پر کتاب کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے اور دوسری جلد کے عنقریب پیش کئے جانے پر اس کا خاتمہ ہوا ہے ۔ یہ ہیں وہ کتابیں جو ہمارے دینی مکتبوں اور دارالعلوموں کے طلبا اور علماء کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ اس سے آپ ان حضرات کی ذہانت، ذکاوت، حسِ لطیف' اور جنسی بدنہادی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کیا اس کے بعد بھی آپ کو اس امر کی تحقیق کے لئے کمیشن بٹھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم ذلیل کیوں ہیں؟

امریکہ کے خلا نوردوں کو سلام

۲۰ اور ۲۱ جولائی کی درمیانی شب کو امریکہ کے دو خلا نورد چاند کی سطح پر اُتر گئے۔ انسانیت کی تاریخ میں یہ واقعہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا کہ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب! ۔۔۔ ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

شاید یہ "تمنا کے دوسرے قدم" کی تلاش کا نقطۂ آغاز ہو۔

میری بچی نے جب یہ خبر سنی تو اسکے منہ سے بیساختہ نکلا کہ "باباجی! آج اللہ میاں کس قدر خوش ہوتے ہونگے"! بچی کے چھوٹے سے منہ سے یہ اتنی بڑی بات نکلی کہ اس نے میرے خیال کا رُخ چاند کی سمت سے ہٹا کر فکر کی دنیا کیطرف موڑ دیا۔ قرآنِ کریم نے قصّہ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ جب ملائکہ نے تخلیقِ آدم پر اعتراض کیا تو اس کے جواب میں خدا کیطرف سے کہا گیا کہ انی اعلم مالا تعلمون۔ اس تخلیقِ نو کے امکانات کے متعلق جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔ اسکے ساتھ ہی آدم میں اشیائے فطرت کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اب ابنِ آدم کا جو قدم بھی رموزِ فطرت کی نقاب کشائی کیطرف اٹھتا ہے وہ ملائکہ کے اعتراض کا جواب اور دعوائے خداوندی کی صداقت کی دلیل، فلہذا "اللہ میاں کے لئے خوشی کا موجب" بن جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اپنے دعاوی کے اثبات کا ایک طریق یہ بتایا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (۵۳/۴۱) "ہم انسانوں کو اپنی نشانیاں عالمِ انفس و آفاق میں دکھاتے جائینگے تاآنکہ یہ بات واضح طور پر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے"۔ قرآن نے انہی آیات میں سے ایک کے متعلق آج سے چودہ سو سال پہلے یہ کہا کہ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِن دَابَّةٍ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ ۔ (۴۲/۲۹) "اور آیاتِ خداوندی میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین اور اجرامِ فلکی کو پیدا کیا اور ان میں جاندار مخلوق کو پھیلا دیا۔ اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق جب چاہے انہیں اکٹھا کر دے"۔ زمین اور چاند کا یہ رابطہ، انہیں اکٹھا کر دینے کی عملی تمہید ہے۔

اور ابھی تو انسان نے اس سفر میں (یوں کہیئے کہ) گھٹنیوں چلنا شروع کیا ہے۔ اسکے بعد دیکھیئے کہ اسکے قدم کہاں کہاں پہنچتے ہیں اور فطرت کے کون کونسے مستور حقائق پر سے پردے اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔

اور جب اس نے تسخیرِ کائنات کیساتھ تسخیرِ خویش بھی کرلی تو پھر (قرآن کے الفاظ میں) "یہ زمین بدل جائیگی۔ یہ آسمان بدل جائینگے"۔ اور یوں اسکے ارادے فطرت کے مقاصد کا معیار بنتے چلے جائینگے۔ تسخیرِ خویش کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے مقاصد کو ان مستقل اقدار کے تابع رکھے جو وحی کے ذریعے عطا ہوتی ہیں تاکہ فطرت کی مسخر کردہ قوتیں تخریبِ عالم کا باعث بننے کے بجائے ارتقائے انسانیت کا موجب بنیں۔

بہرحال، یہ عظیم دن، عالمگیر انسانیت کے لئے جشنِ مسرت منانے کا روز، اور ان اربابِ عزم و ہمم کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کی تقریب ہے جنہوں نے پروازِ انسانی کے لئے اس قدر وسیع راستے کھولے ہیں اور یہ تخیل ایک حقیقت بن کر سامنے آرہا ہے کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

(اقبالؒ)

پرویز (۲۱ جولائی)

کفر کے فتوے

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت جولائی ۱۹۹۶ء) کے لمعات میں ہم نے ضمناً یہ لکھا تھا کہ بدقسمتی سے مسلمانوں کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جس کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ یہ کلیہ بعض حضرات کو بڑا تعجب انگیز معلوم ہوا ہے۔ چنانچہ ان کی طرف سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم اپنے اس بیان کی وضاحت کریں اور تفصیل سے بتائیں کہ یہ فی الواقعہ حقیقت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات وہ ہیں جو کچھ زیادہ عرصہ سے طلوع اسلام سے متمسک نہیں، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ ہم (جستہ جستہ اشارات کے علاوہ) اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ لکھ چکے ہیں جو اپریل ۱۹۷۶ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ زیر نظر مضمون اسی مقالہ سے مقتبس ہے جسے ہم ان حضرات کے مطالبات و استفسارات کے پیش نظر شائع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ امید ہے ہماری یہ کوشش امت میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اس سلسلہ میں ہم اتنا اور عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ مسلمانوں میں فرقہ اسے کہتے ہیں جو اقلیت میں ہو۔ امت کا سواد اعظم (یعنی جمہور مسلمان جن کی تعداد اکثریت میں چلی آرہی ہے) فرقہ نہیں اور کفر کے فتوے فرقوں کے خلاف صادر ہوتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ "سواد اعظم" کے خلاف نہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ اس سواد اعظم کو عرف عام میں اہل سنت والجماعۃ (یا سُنّی حضرات) کہا جاتا ہے۔ ہم اس مقالہ میں صرف اتنا بتائیں گے کہ خود اہل سنت والجماعت حضرات نے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف کس قدر کفر کے فتوے لگائے ہیں۔ اگر شروع سے آج تک کے اقلیت کے فرقوں کے خلاف کفر و ارتداد کے فتاویٰ کی بات چھیڑ دی جائے تو یہ داستان سمیٹے سے سمٹ نہ سکے۔ اس لئے ہم اس بحث کو اہل سنت والجماعت تک محدود رکھیں گے۔

---(٭)---

اگر ہم کسی کو ایک فقرہ میں بتانا چاہیں کہ نبی اکرمؐ نے اپنی حیات طیبہ میں کیا عظیم کام سرانجام دیا

تھا تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ غیر مسلموں کو حضورؐ نے حلقہ بگوش اسلام بنا کر دین کا نظام قائم کیا تھا۔ غیر مسلموں کو مسلمان بنا کس قدر مشکل کام تھا اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حضورؐ کی نبوت کی عمر تیئیس ۲۳ سال کی تھی۔ اور چونکہ حضورؐ خدا کے آخری نبی تھے اسلئے یہ تیئیس ۲۳ سال کا عرصہ قیامت تک پھیلا ہوا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو حضورؐ کی

کافروں کو مسلمان بنانا

حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ ہزاروں سال پر بھاری تھا۔ اس عظیم القدر، اہم اور قیمتی، مبارک زندگی کا پچاس فیصد سے زیادہ حصہ (تیئیس ۲۳ میں سے تیرہ ۱۳ سال) مکہ میں بسر ہوا۔ وہاں آپؐ کو جس قدر مصیبتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ سب پر عیاں ہیں۔ اس قدر طول طویل عرصہ اور ایسی جانکاہ مشقتوں اور مصیبتوں کا ماحصل کیا تھا؟ تین سو کے قریب افراد کا حلقۂ اسلام میں داخل ہونا۔ اس سے آپ اندازہ لگایئے کہ ایک غیر مسلم کو مسلمانوں کی جماعت میں داخل کرنے کے لئے حضورؐ کو کتنا وقت صرف کرنا، اور کس قدر جانکاہ اور صبر آزما مراحل میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد، حضورؐ کی مدنی زندگی کا دور شروع ہوا۔ اس میں مسلمانوں کی اس مٹھی بھر جماعت کو، دشمنوں کے حملوں سے بچانے اور اس طرح اس متاعِ گراں بہا کو محفوظ رکھنے کے لئے حضورؐ اور آپؐ کے ہمراہ قدوسیوں کی اس جماعتؓ کو کتنی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اور جان و مال کی کس قدر قربانیاں دینی پڑیں۔ اس طرح محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے ایک ایک قطرہ اکٹھا کر کے امتِ مسلمہ کی جوئے رواں کو متشکل فرمایا جس نے اپنے ایمانِ محکم اور عملِ پیہم سے تھوڑے سے عرصہ میں ایک بحرِ ذخار کی شکل اختیار کر لی۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہم و رضوا عنہ۔

اس کے بعد جب خلافت کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو دین میں ثنویت (DUALISM) پیدا ہو گئی۔ یعنی سیاست، دین سے الگ ہو گئی۔ اس سے ایک طرف ملوکیت وجود میں آ گئی اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت (PRIEST - HOOD)۔ حالانکہ دین، ان دونوں کو مٹانے کے لئے آیا تھا اور اس نے انہیں مٹا کر دکھا دیا تھا۔

ملوکیت نے اسلام کے ساتھ کیا کیا؟ اسے اس وقت چھوڑیئے۔ مذہبی پیشوائیت نے جو کچھ کیا

مسلمانوں کو کافر بنانا

اسے دو فقروں میں یوں سمجھئے کہ اس نے پہلے اس امتِ واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اسے فرقوں میں تقسیم کر دیا اور پھر ایک ایک مسلمان کو کافر قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا۔ یعنی نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ نے ہزار مصیبتیں جھیل کر، ایک ایک غیر مسلم کو حلقہ بگوش اسلام بنایا تھا اور ان حضرات نے حلقہ بگوشانِ اسلام کو ایک ایک کر کے کافر بنا دیا۔

اُمّتِ مسلمہ کی خصوصیات

نبی اکرمؐ نے جو امت تیار کی تھی، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ۔

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ (۳/۱۰۳)

تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو (جس سے اس نے تمہیں نوازا ہے) تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت پیدا کر دی اور اپنی عنایات سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔

ایسے بھائی جن کے متعلق کہا کہ وہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ہیں۔ یعنی دشمنوں کے مقابلہ میں چٹان کی مانند سخت اور آپس میں نہایت ہمدرد۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی، اور نہایت ہمدرد، غمخوار اور غمگسار بھائی بنایا تھا۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے ان بھائیوں کو اس طرح ایک دوسرے سے جدا کر دیا، اور آپس میں دشمن بنا دیا، کہ وہ ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے لگ گئے۔ قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں کہا تھا کہ یاد رکھو۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ (۴/۹۳)

جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ اس میں رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی اور اس کے لئے خدا سخت عذاب تیار کریگا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا اور ہماری مذہبی پیشوائیت نے یہ مسلک اختیار کیا کہ

(۱) پہلے امت کو فرقوں میں بانٹا۔ پھر

(۲) ایک فرقہ نے دوسرے فرقے کو مرتد اور کافر قرار دیا۔ اور

(۳) یہ فتویٰ دیدیا کہ ان مرتدوں کی سزا قتل ہے۔

اس طرح سربازار مسلمانوں کی گردنیں خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے اڑنے لگیں۔ اگر آپ تاریخ اسلام کو دیکھیں

مسلمانوں کا خون

تو آپ کو نظر آجائے گا کہ اس ہزار بارہ سو سال کے عرصہ میں کفار کے ہاتھوں اتنے مسلمان شہید نہیں ہوئے جتنے خود دوسرے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔

اور آپ کو معلوم ہے کہ کس قسم کی باتوں پر ایک دوسرے کے قتل کے فتوے دیئے جاتے تھے؟ مثلاً اگر کسی نے کہدیا کہ قرآن مخلوق ہے تو اس کو کافر قرار دے دیا گیا اور قتل کر دیا۔ دوسرے نے کہدیا کہ نہیں، قرآن قدیم ہے۔ تو اسے کافر قرار دیکر قتل کر دیا۔ اگر کسی نے کہدیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا ہے تو اسے کافر قرار دے

دیا کسی نے کہہ دیا کہ ذبح واجب ہے تو اسے کافر قرار دے دیا۔ غرضیکہ ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو کافر بنانے اور اس کے قتل کے فتوے صادر کرتے رہتے۔ بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ، مفسرین، محدثینؒ، علماء، فقہاءؒ وغیرہ ان کے فتووں کا نشانہ بنائے گئے۔ کسی کو قتل کیا، کسی کی زندہ کھال کھنچوائی گئی، کسی کو جیل خانے بھجوایا، کسی کو کوڑوں سے پٹوایا، کسی کا گھر پھونکا گیا، کسی کی کتابیں جلائی گئیں، کسی کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا گیا، کسی کی لاش کو پامال کیا گیا، کسی کی قبر پر گدھوں کے ہل چلوائے گئے، کسی کی تشہیر کی گئی کسی کو ذلیل کیا گیا۔ غرضیکہ ان کے ہاتھوں نہ کسی کی جان محفوظ رہی نہ مال۔ نہ عزت مصئون رہی نہ آبرو۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی ہے اور ہم ابھی تک ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کے "جہادِ عظیم" میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالت پر رحم کرے۔

فرقہ بندی

آگے بڑھنے سے پیشتر ہم یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ (جیسا کہ قارئین طلوعِ اسلام کو اچھی طرح معلوم ہے) ہم کسی فرقے سے متعلق نہیں ہیں۔ نہ ہی ہم نے کوئی اپنا فرقہ بنایا ہے۔ فرقہ سازی کے متعلق قرآن کریم نے کہا تھا کہ

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿۳۰/۳۱﴾

(مسلمانو! دیکھنا، تم ایمان لانے کے بعد پھر سے) مشرکوں میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے۔ پھر حالت یہ ہو گئی کہ ہر گروہ اپنے اپنے طریقے میں مگن ہے۔

اسلئے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ﴿۶/۱۵۹﴾

اے رسول! جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہ بن بیٹھے، تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

نبی اکرمؐ کے زمانے میں مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ سب مسلمان تھے — ہمارا بھی کسی فرقے سے تعلق نہیں — نہ کسی قدیم فرقہ سے نہ جدید سے۔ نہ ہی ہمارا اپنا کوئی الگ فرقہ ہے۔ ہم صرف مسلمان ہیں اور ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ یعنی اللہ پر ایمان۔ انبیائے کرامؑ پر ایمان۔ کتابوں پر ایمان۔ ملائکہ پر ایمان۔ آخرت پر ایمان۔ اس لئے ہم اگر ذیل میں کچھ مثالیں پیش کریں گے (جن میں بتایا جائے گا کہ ہمارے علمائے کرامؒ کے فتووں کی رو سے

کوئی شخص بھی مسلمان نہیں رہتا۔ تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم کسی خاص فرقے کی تائید یا تردید کرتے ہیں۔ ہم صرف مثالیں پیش کرتے ہیں اور وہ بھی دل پر پتھر رکھ کر۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا اسلام کی رُو سے سب سے بڑا جُرم ہے۔ لہذا ہمیں ان حضرات کی کفرسازی کی داستاں دہرا کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔

(۰)

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اس مقالہ میں ہم اپنی بحث کو اہل سنت والجماعت تک محدود رکھیں گے۔ اہل سنت والجماعت حضرات دو بڑے بڑے فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ غیر مقلد (جنہیں عام طور پر اہلحدیث کہا جاتا ہے) اور مقلد (جنہیں عام طور پہ حنفی کہا جاتا ہے)۔

(۲) مقلد پھر دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی۔

(۳) اور تصوّف کے مختلف خانوادوں سے متعلق حضرات۔ (یہ بھی مقلدین ہی میں شامل ہوتے ہیں)۔

اب دیکھئے کہ یہ فرقے کس طرح آپس میں ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں[1]

غیر مقلّدین کے خلاف مقلّدین کا فتوےٰ

(۱) فرقہ غیر مقلدین، جن کی علامتِ ظاہری اس ملک میں آمین بالجہر، رفع یدین اور نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنا اور امام کے پیچھے الحمد پڑھنا ہے، اہلسنت سے خارج ہیں اور مثل دیگر فرق ضالہ (۔۔۔۔۔۔) کے ہیں۔ کیونکہ ان کے بہت سے عقائد اور مسائل مخالف اہلسنت کے ہیں۔ ان کے پیچھے نماز درست نہیں۔ ان سے مخالطت و مجالست کرنا، اور ان کو اپنی خوشی سے مسجد میں آنے دینا شرعاً ممنوع ہے۔

(اس کے نیچے قریب ستر علماء کی مہریں ثبت ہیں۔

بحوالہ جامع الشواہد فی اخراج الوہابین عن المساجد۔ صفحہ)

(۲) پس تقلید کو حرام اور مقلدین کو مشرک کہنے والا شرعاً کافر بلکہ مرتد ہوا۔

(انتظام المساجد باخراج اہل فتن عن المساجد)

---

[1] ہم نے ان فتووں میں سے بیشتر کو، محترم پیر رشید الدولہ صاحب سجادہ نشین حضرت شاہ دولہ صاحب گجرات کے ایک مقالہ سے لیا ہے جسے ادارہ علمیہ ہندیہ، اچھرہ لاہور نے شائع کیا تھا اور جس کا عنوان تھا "کفر ساز اسلام"۔ یعنی مولوی صاحب کا غلط مذہب۔ حوالے بھی وہیں سے نقل کئے گئے ہیں۔ اس کیلئے ہم پیر صاحب کے شکر گذار ہیں۔

(۳) علماء اور مفتیانِ وقت پر لازم ہے کہ بجرد مسموع ہونے ایسے امر کے، اس کے کفر اور ارتداد کے فتوے دینے میں تردد نہ کریں، ورنہ زمرۂ مرتدین میں یہ بھی شامل ہوں گے۔ (ایضاً)

(۴) مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی نے غیر مقلدین کے تمام گروہوں کے نام بنام عقائد لکھ کر فتویٰ لکھا ہے کہ

یہ طائفے سب کے سب مرتد و کافر ہیں اور جو ان کے کفر و عذاب میں شک کرے، وہ خود کافر ہے۔ (کتاب حسام الحرمین)

مقلدین کیخلاف غیر مقلدین کا فتویٰ

(۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین اس امر میں کہ یہ گروہ مقلدین جو ایک ہی امام کی تقلید کرتے ہیں، اہل سنت والجماعت میں داخل ہیں یا نہیں اور ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں۔ اور ان کو اپنی مسجد میں آنے دینا اور ان کے ساتھ مخالطت اور مجالست جائز ہے یا نہیں؟

جواب۔ بیشک نماز ایسے مقلدین کے پیچھے صحیح نہیں ہوگی کہ ان لوگوں کے عقاید اور اعمال مخالف اہل سنت والجماعت ہیں۔ بلکہ بعض عقیدہ اور عمل موجب شرک اور بعض مفسد نماز ہیں۔ ایسے مقلدوں کو مسجد میں آنے دینا شرعاً درست نہیں۔

اس کے نیچے (۱۹) مولوی صاحبان کی مہریں ثبت ہیں۔

(بحوالہ کتاب مجموعہ فتاویٰ صفحہ ۵۵-۵۴)

(۲) نواب صدیق حسن خان صاحب (مرحوم) فرماتے ہیں:

مقلدین پر اطلاق لفظ مشرکین کا۔ تقلید پر اطلاق لفظ شرک کا کیا جاتا ہے۔ دنیا میں آجکل اکثر لوگ مقلد پیشہ ہیں۔ وما یؤمن اکثرھم الا وھم مشرکون۔ یہ آیت ان پر بخوبی صادق ہے۔ (اقترب الساعۃ۔ صفحہ ۱۶)

صرف حنفی نہیں بلکہ سب کے سب

چاروں اماموں کے پیرو اور چاروں طریقوں کے متبع۔ یعنی حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی اور نقشبندیہ قادریہ۔ نقشبندیہ مجددیہ۔ سب لوگ کافر ہیں۔ (جامع الشواہد۔ صفحہ ۲)

دیوبندیوں کے خلاف تین سو علماء کا فتویٰ

وہابیہ دیوبندیہ اپنی تمام عبارتوں میں تمام اولیاء، انبیاء، حتیٰ کہ حضرت سید الاولین و آخرین (صلے اللہ علیہ وسلم) اور خاص ذات باری تعالیٰ کی اہانت اور ہتک کرنے کی وجہ سے قطعاً مرتد اور کافر ہیں۔ اور ان کا ارتداد اور کفر سخت سے سخت درجہ تک پہنچ چکا ہے۔ ایسا کہ جو ان مرتدوں اور کافروں کے ارتداد اور کفر میں ذرا بھی شک کرے مرتد اور کافر ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان سے بالکل ہی محترز اور مجتنب رہیں۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا تو ذکر ہی کیا ہے اپنے پیچھے بھی ان کو نماز نہ پڑھنے دیں اور نہ ہی مسجدوں میں گھسنے دیں۔ نہ ان کا ذبیحہ کھائیں۔ نہ ان کی شادی غمی میں شریک ہوں۔ نہ اپنے پاس ان کو آنے دیں۔ یہ بیمار ہوں تو عیادت کو نہ جائیں۔ مریں تو گاڑنے توپنے میں شرکت نہ کریں۔ مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ نہ دیں۔ غرض ان سے بالکل احتیاط و اجتناب رکھیں۔ (دیکھو تین صد علماء کا متفقہ فتویٰ)

(المشتہر۔ محمد ابراہیم بھاگلپوری)

دیوبندیوں کو اقلیت قرار دیا جائے

مارچ ۱۹۵۳ء میں کراچی کے در و دیوار پر ایک اشتہار چسپاں کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا۔

مُطالبات

فرقہ دیوبندیہ کو علیحدہ اقلیتی فرقہ تسلیم کیا جائے!

اس اشتہار میں منجملہ دیگر امور لکھا تھا کہ

جس طرح سکھ ہندوؤں سے نکلے لیکن ہندو نہیں ہیں۔ یا انگلینڈ کے پراٹسٹنٹ رومن کیتھلک سے نکلے مگر رومن نہیں۔ اسی طرح دیوبندی فرقہ اہل سنت والجماعت سے نکلا مگر اہل سنت و الجماعت نہیں۔ اس فرقہ دیوبندیہ کے نمائندگان خصوصی۔ مفتی محمد شفیع صاحب۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب۔ مولانا احتشام الحق صاحب۔ مسٹر ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہم ہیں۔

اس کے بعد مطالبہ یہ پیش کیا گیا تھا کہ اس فرقہ کو اقلیت تسلیم کیا جائے۔ اس اشتہار کے نیچے ۸۲ حضرات کے دستخط تھے۔

(طلوع اسلام۔ مئی ۱۹۵۳ء صفحہ ۶۴)

بریلویوں کیخلاف دیوبندیوں کا فتویٰ

مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب دیوبندی نے اپنی کتاب میں مولوی احمد رضا خاں صاحب کو کافر، اکفر، دجالِ ما نہ حاضرہ۔ مرتد۔ خارج از اسلام وغیرہ ثابت کیا ہے۔

(رسالہ رد التکفیر علی الفحاش التنظیر)

دوسری طرف

مولانا احمد رضا خاں صاحب (بریلوی) نے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (بانیٔ دارالعلوم دیوبند) اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی وغیرہ کے عقاید کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ کلھم مرتدون باجماع الاسلام۔ (یہ سب باجماع الاسلام مرتد ہیں) اس فتویٰ پر علماء حرمین شریفین اور دیگر مفتیوں اور قاضیوں کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں۔ ان کی تین وجوہ تکفیر بیان کی گئی ہیں۔ (۱) ختم نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ (۲) آنحضرتؐ کی توہین کرتے ہیں۔ (۳) امکانِ کذب باری تعالےٰ۔

اسلئے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

جو ان کے کافر ہونے میں شک کرے، وہ بھی کافر ہے۔

(حسام الحرمین۔ صفحہ ۱۳ تا ۱۰۰)

آپ نے غور فرمایا، پاکستان میں بسنے والا سواد اعظم ——— یعنی حنفی۔ اہلحدیث۔ دیوبندی۔ بریلوی۔ یا ارباب طریقت میں چشتیہ۔ قادریہ۔ نقشبندیہ وغیرہ۔ ان سب کے خلاف کفر و ارتداد کے فتوے لگ چکے ہیں۔

پھر مختلف فرقوں کی تکفیر تک ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ ان فرقوں کے ممتاز افراد کے خلاف نام بنام فتاوے صادر کئے گئے اور انہیں ہدف دشنام بنایا گیا۔ مثلاً

مولانا نذیر حسین دہلوی

انہیں عبادل، مرتاب۔ متبع ہوائے نفس، حاسد، بددیانت۔ منحرف قرار دیا گیا۔

(رسالہ التحقیق المزید لمن ھوفی یطعن امام السعید ۔۔۔۔۔)

اسکے ساتھ مولوی محمد حسین بٹالوی مرحوم

کو شامل کر کے انہیں

شیاطین۔ ملحد۔ بیوقوف۔ بے شعور۔ بے دین۔ وغیرہ کہا گیا۔
اس فتویٰ پر ۸۲ علماء حرمین شریفین اور علمائے عجم کی مہریں ثبت ہیں۔ (کتاب نقد الحق)

مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کے خلاف جو فتاویٰ شائع کئے گئے اور جنہیں مکہ معظمہ جاکر حاصل کیا گیا، ان میں ان کی تفسیر کے متعلق لکھا ہے۔

ایک بدعتی اور گمراہ کا کلام ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں حلولیہ۔ اتحادیہ۔ جہمیہ اور معتزلہ مذہب کو جمع کر رکھا ہے۔ نہ تو مولوی ثناء اللہ سے علم حاصل کرنا جائز ہے، نہ اس کی اقتداء جائز ہے۔ نہ اس کی شہادت قبول کی جائے۔ نہ اسکی امامت صحیح ہے۔ اس کے کفر اور مرتد ہونے میں کوئی شک نہیں۔ . . . . . اس کی تفسیر اس قابل ہے کہ اس کا مقاطعہ کیا جائے۔ بلکہ تردید کی غرض سے دیکھنے کے سوا اس کا دیکھنا بھی حرام ہے۔

(فیصلہ مکہ۔ صفحہ ۲۰۔ ۱۵)

مولانا حسین احمد مدنی مرحوم مولانا مدنی نے مکتوب ۳۸ کے صفحہ ۱۰۰ پر، روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

احادیث خواہ قدسیہ ہوں یا غیر قدسیہ، ان کے نقل کرنے والے اتنے کثیر نفوس نہیں ہیں۔ اسلئے ان میں احتمال جھوٹ یا غلطی کا آتا ہے۔ اس لئے قطعی الثبوت نہیں ہوں گی اور ان کا منکر کافر نہیں ہوگا۔ یہ تو فرق ہے ہمارے لئے۔ صحابہؓ کے لئے نہیں۔ ان کے لئے قرآن اور ارشادات نبویؐ قطعی الثبوت ہیں۔ وہ اگر ایک حدیث سننے کے بعد منکر ہوں تو کفر لازم آئے گا۔

مولانا مرحوم کے اس اقتباس پر حکیم محمد اشرف سندھو بلوکی کے قلم سے "حیرت انگیز انکار حدیث" کے عنوان سے جماعت اہل حدیث کے اخبار "اہلحدیث" بابت یکم جولائی ۱۹۶۱ء میں ایک تبصرہ شائع ہوا جس کا ملخص ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور کی ۱۰ نومبر ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں بالفاظ ذیل شائع ہوا ہے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی، دیوبندی، اول درجہ کے عالم اور خادم قرآن و حدیث بزرگ گزرے ہیں۔ آپ محتاج تعارف نہیں۔ مگر آپ کا ایک مکتوب دیکھ کر بہت ہی صدمہ ہوا جس میں انکار حدیث کا بھیانک تصور موجود ہے۔ اس تصور سے معتزلہ جہمیہ کے علاوہ نیچریت چکڑالویت اور پرویزیت کا ریکارڈ بھی ختم ہو گیا۔

ان سب پر جن کا ریکارڈ مولانا مدنی (مرحوم) نے ختم کر دیا ہے، کفر کے فتوے لگ چکے ہیں۔ اس سے مولانا مدنی کے کفر کی بات واضح ہو جاتی ہے۔

مودودی صاحب کے خلاف

(جیسا کہ ہم طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں لکھ چکے ہیں) سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے خلاف، قریب قریب ہر فرقے کے علماء کی طرف سے فتوے لگ چکے ہیں۔ جن میں ان کی تحریک کے متعلق کہا گیا ہے کہ

یہ تحریک کوئی نئی تحریک نہیں۔ یہ وہی پرانی خارجیت ہے جو نئے نئے روپ اختیار کر چکی ہے۔

(دار العلوم منظر الاسلام - بریلی)

مفتی مظہر اللہ صاحب (جامع فتحپوری۔ دہلی) اپنے فتوے میں لکھتے ہیں۔

ان باتوں کا ظاہر تو یہی ہے کہ مسلم کو اہل سنت سے خارج کرنے والی ہیں اور یقیناً تفریق بین المسلمین کی موجب اور نئے فرقے کے پیدا کرنے کے لئے بنیاد ہے لیکن بنظر تعمق نظر کیجئے تو کفر تک پہنچانے والی ہیں ـــ ایسی صورت میں نیا فرقہ پیدا کرنے والی نہیں بلکہ فرقہ مرتدین میں داخل کرنے والی ہیں۔

علیگڑھ کے مولانا حفیظ اللہ صاحب نے لکھا ہے۔

جو حکم مسجد ضرار کا ہے اس جیسے حکم میں یہ جماعت بھی داخل ہے۔

"مسجد ضرار" کے متعلق قرآن کریم میں "کفرا" کا لفظ آیا ہے لہٰذا ان کے متعلق بھی کفر کا حکم ہوا۔ مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم (دیوبندی) اپنے فتویٰ میں رقمطراز ہیں۔

میرے نزدیک یہ جماعت اپنے اسلاف (یعنی میرزائی) سے بھی زیادہ مسلمانوں کے دین کے لئے ضرر رساں ہے۔

مفتی سید مہدی حسن صاحب، صدر مفتی دار العلوم دیوبند اپنے فتوے میں لکھتے ہیں۔

اگر کوئی شخص مسجد کا امام مودودی صاحب کا ہم خیال ہو تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب مدنی (مرحوم) مودودی کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ

آپ کی تحریک اسلامی مخالف سلف صالحین مثل معتزلہ۔ خوارج۔ روافض۔ جہمیہ وغیرہ فرق قدیمہ اور مثل قادیانی۔ چکڑالوی۔ مشرقی۔ نیچری۔ مہدوی۔ بہائی وغیرہ فرق جدیدہ ایک نیا اسلام بنانا چاہتی ہے اور وہ ان اصول و عقاید و اعمال پر مشتمل ہے جو کہ اہل سنت و الجماعت اور

اسلاف کے خلاف ہیں۔

مولانا احمد علی (مرحوم) کی جمعیت علماء (لاہور) نے مودودی صاحب کے متعلق ایک اشتہار میں لکھا تھا کہ

ان کا اجتہاد قرآن کے مقابلہ میں شیطنی ہے۔

اس کے بعد لکھا تھا۔ کہ

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مودودی صاحب اور اس نام نہاد اسلامی جماعت کے شر اور دھوکے سے بچائے۔

سرسید احمد خان پر فتوے!

سرسید مرحوم کے متعلق تکفیر و تفسیق کی جو مہم طوفانِ بلاخیز کی طرح اٹھی، اس کے متعلق، مولانا حالیؔ نے حیاتِ جاوید میں شرح و بسط سے لکھا ہے۔ اس کے چیدہ چیدہ فقرے ملاحظہ فرمائیے۔

(ان رسائل میں) سرسید کو ملحد۔ لامذہب۔ کرسٹان۔ نیچری۔ دہریہ۔ دجّال۔ اور کیا کیا خطاب دیئے گئے۔ ان کے کفر کے فتوے پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مہریں اور دستخط کرائے گئے۔ یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے ان کی بھی تکفیر ہونے لگی۔ (ص ۶۲۳)

مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں۔ کیا سنّی کیا شیعہ۔ کیا مقلد کیا غیر مقلد۔ کیا وہابی کیا بدعتی۔ سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں..... مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم لکھنوی، جو علمائے فرنگی محل میں نہایت نامور اور ثقہ مفتی تھے عبارت میں تحریر فرماتے ہیں۔ "وجودِ شیطان اور جنیہ کا منصوص قطعی ہے اور منکر اسکا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ شیطان کو خود بھی اپنے وجود سے انکار نہیں..... اور وجودِ آسمان منصوص قرآنی ہے۔ منکر اس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہے...... (یہ شخص) مخرب دین متین لعین کے وسوسہ سے بصورتِ اسلام میں تخریب دینِ محمدی کی فکر میں ہے اور بنامِ تجدید، مدرسۂ جدیدہ افسادِ شریعت اس کی منظورِ نظر ہے۔ جو چیزیں اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں۔ (صفحہ ۶۲۹-۶۲۷)

ایک فتویٰ مکہ معظمہ سے منگوا لیا گیا، جس پر "مذاہب اربعہ" کے مفتیوں نے مہریں لگائیں۔ اس میں لکھا تھا کہ

یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہوگیا ہے۔ یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا۔ یا اباحتی ہے کیونکہ منخنقہ کا کھانا مباح بتاتا ہے اور اہلِ مذہب حنفی) کے بیانات

سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کرلی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہوگئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہے دین حق کی حفاظت کے لیے۔ (صفحہ ۶۳۳)

علی گڑھ کالج کے متعلق

یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اس کے بانی کو ہلاک کرے اس کی اعانت جائز نہیں ہے۔ اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اس کے بانی سے اور اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے۔ اور ہر شخص پر جس میں حمیتِ اسلامی ہو واجب ہے اس مدرسہ کی مخالفت جہاں تک کہ قدرت ہو اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دل سے اس کا مخالف ہو۔ (صفحہ ۶۳۴)

آپ سوچئے کہ اگر ان فتووں کے مطابق اُس وقت علی گڑھ کالج نہ بنتا۔ یا تباہ کر دیا جاتا، تو آج ہمارا کیا حشر ہوتا؟ کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ پاکستان کی جداگانہ مملکت کبھی وجود میں نہ آتی۔ اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو کے غلام رہتے۔

سرسید کا جواب

سرسید نے ان فتووں کا جو جواب دیا تھا، اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخر الزمان محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اُس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو اور کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔ (حیات جاوید صفحہ ۶۲۶)

بلکہ ہمارے نزدیک کفر کے ان فتووں کا جواب، اس سے بہتر کوئی نہیں تھا جو سرسید رح نے اس ایک شعر میں دے دیا تھا ___ کہ

خدا دارم. دلے بریاں ز عشقِ مصطفےٰ دارم

ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

قائداعظمؒ و اقبالؒ سرسیدؒ نے تو صرف مذہبی امور کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان حضرات نے قائداعظمؒ کو کافرِ اعظم کہہ کر پکارا تھا۔ اور حکیم الامت علامہ اقبالؒ جیسے مردِ مومن پر بھی کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا تھا۔

(۰)

قرونِ اولیٰ کے بزرگانِ عظام پر کفر و ارتداد کے فتوے

ہمارے ہاں کافر گری کا یہ شغلہ اسی زمانے کی پیداوار نہیں۔ ہماری بدقسمتی سے یہ مرض بہت پرانا ہے اور امت کے بزرگانِ عظام میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جو اس کی زد سے بچ گیا ہو۔ اس سلسلہ میں بڑی لمبی چوڑی فہرست پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے ذیل کے چند اسمائے گرامی کا درج کر دینا کافی ہوگا۔ (واضح رہے کہ ہم نے صحابہ کبارؓ کے نام اس فہرست سے عمداً خارج کر دیئے ہیں کیونکہ ہم اس کی جرأت نہیں کر سکتے) صحابہؓ کے بعد کے دور کے بزرگانِ کرام کے متعلق دیکھئے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی بہت بے ادبی ہوئی۔ بعض نے جاہل بعض نے بدعتی بعض نے زندیق اور بعض نے کافر کہا۔ انکار کرنے پر عہدۂ قضاء سے آپ پر سختی ہوئی ..... آخر قید خانہ میں زہر دیئے گئے اور ماہ رجب ۱۵۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔ ابو یوسف ابن خالد نے آپ سے وتر کا مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا۔ وتر واجب ہے۔ تو اس نے کہا۔ کفرت یا ابوحنیفہ۔

ابوعبداللہ امام محمد بن ادریس شافعیؒ آپ کو ابلیس کہا گیا۔ رفض کی طرف نسبت کر کے قید کیا گیا۔ آپ کے مرنے کی دعائیں کی گئیں۔ یمن سے بغداد تک بے ادبی۔ بے حرمتی اور بے عزتی سے قید کر کے لیجایا گیا۔ وفات آپکی رجب ۲۰۴ھ میں ہوئی۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ آپ بہت متقی اور پرہیزگار امام تھے۔ آپ کو اٹھائیس مہینے قید رکھا گیا۔ وزنی زنجیریں آپ کے پاؤں میں ڈالی گئیں۔ جلسوں میں بلا کر ذلیل کئے گئے۔ آپ کے منہ پر طمانچے مارے گئے اور تھوکا گیا۔ آپ کے ہمراہ ابو قیس زیادی۔ نصر بن شمیل ہواریری۔ ابو نصر تمار علی

بن مقاتل شبیرین الوحیدی وغیرہ کو پولیس کی حراست میں رکھا گیا۔ ہر شام کو جیل خانہ سے نکالکر کوڑے مارے جاتے تھے۔ یہ سب کچھ قدم وخلق قرآن کے مسئلہ کے سلسلہ میں ہوا۔

ابو عبداللہ امام مالک بن انسؓ آپ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ آپ کو سخت اذیتیں دی گئیں۔ آپ کی مشکیں اس بے دردی سے کسی گئی تھیں کہ آپ کا ہاتھ بازو اکھڑ گیا۔ آپ قید میں بھی رہے آپ کو کوڑے بھی لگائے گئے۔

امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ کو دیس سے نکالا گیا۔ خدا تعالےٰ کی زمین آپ پر تنگ کی گئی۔ عزہ شوال ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔ (از ترجمہ فارسی مشکوٰۃ شیخ عبدالحق۔ ہدیہ مجددیہ صفحہ ۷۳)

ابو عبدالرحمٰن امام نسائیؒ کی مسجد میں بے حرمتی ہوئی اور ایسا مارا کہ آپ کی وفات اسی وجہ سے ہوئی۔ سن وفات ۳۰۳ھ۔ (از ترجمہ مشکوٰۃ فارسی)

شیخ الاسلام محی الدین ابو محمد عبدالقادر الحسنی والحسینی الجیلانیؒ کو فقہا نے کافر کہا۔

شیخ محی الدین ابن عربیؒ جو شیخ اکبر کہلاتے ہیں ان کو اکفر کہا گیا بلکہ حضرات مولویوں نے یہ فتویٰ دیا کہ کفرہ اشد من کفر الیھود والنصاریٰ۔ مزید برآں اُنکے تمام گروہ پر تکفیر کا فتوے جاری کیا گیا۔ حتیٰ کہ انکے کفر پر شک کرنے والوں پر بھی کفر کا فتویٰ دیا گیا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ۔ شیخ فرید الدین عطارؒ کو کافر کہا گیا اور جو شخص ان کو کافر نہ کہے اسکے متعلق بھی کفر کا فتویٰ دیا گیا۔

امام غزالیؒ کو کافر قرار دیا گیا اور ان کی کتابوں کو جلانا اور ان پر لعنت کرنا ثواب سمجھا گیا۔ (کتابوں کو جلوانا اور جلانے کے متعلق مطالبہ کرنا یہ پرانی رسم ہے۔)

امام ابن تیمیہ کے متعلق شاہ مصر نے حاجی برہان الدین سے قتل کا فتویٰ طلب کیا۔

امام حافظ ابن قیمؒ کو قید کیا گیا، شہر بدر کیا گیا اور بے حد اذیتیں دی گئیں۔

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ۔ شیخ احمد فاروقیؒ پر کفر کا فتویٰ دیا گیا، سخت بے ادبی کی گئی۔

شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ پر بدعتی اور گمراہی کا الزام لگایا گیا۔

حضرت سید احمد بریلویؒ کو کافر ملحد کہا گیا۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ پر کفر کے فتوے مکہ مکرمہ کے مفتیوں سے لگوائے گئے۔

مولانا عبداللہ غزنویؒ کو اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں جلاوطن کیا گیا اور فتوے لگائے گئے۔

فتوے کیوں لگتے تھے؟ فتوے لگانے کی متعدد وجوہات اور مختلف مقاصد ہوتے تھے۔ مثلاً (۱) سیاسی مقاصد۔ جب کوئی بادشاہ یا حاکم کسی بڑی شخصیت کی طرف سے اپنے لئے خطرہ محسوس کرتا، اور اسے اس کا بھی اندیشہ ہوتا کہ اس پر روپیہ ہاتھ ڈالنے سے رعایا بگڑ جائے گی، تو اس کے خلاف کفر اور ارتداد کا فتویٰ حاصل کر لیا جاتا۔ اور اس طرح اس کانٹے کو نہایت آسانی سے راستے سے نکال دیا جاتا۔ یا جو شخص بادشاہ وقت سے مختلف عقیدہ رکھتا اسے ذبح کر دیا جاتا۔ مثلاً دوسری صدی ہجری میں جعد بن درہم نے یہ کہا کہ قرآن مخلوق ہے۔ اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا۔ اور خالد بن عبداللہ والیٔ عراق نے اسے عیدالاضحیٰ کے دن، بطور قربانی ذبح کیا۔ اس کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور مامون الرشید خود قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل ہو گیا۔ اب دوسرے گروہ پر کفر کے فتوے لگنے شروع ہو گئے اور امام احمد بن حنبلؒ جیسی شخصیت کو جس طرح قید و بند کی اذیتیں پہنچائی گئیں، ان کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ خلیفہ واثق نے احمد بن نصر کو اس عقیدہ کی بنا پر خود اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور اس کے جسم کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے کان میں ایک رقعہ رکھ دیا گیا جس میں لکھا تھا۔

یہ احمد بن نصر مشرک اور گمراہ کا سر ہے جس کو امیر المومنین نے بغرض تقرب اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔

تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

(۲) جب دین فرقوں میں بٹ جائے تو ہر فرقہ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مضبوط اور غالب رہے۔ فرقہ کو مضبوط رکھنے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہوتا کہ اس کی افضلیت اور حقانیت کو ثابت کیا جائے، بلکہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ دوسرے فرقوں کی طرف سے نفرت دلائی جائے۔ اس طرح فرقوں کی باہمی کشمکش شروع ہوتی اور جاری رہتی ہے۔ اسے قرآن نے بغیاً بینھم سے تعبیر کیا ہے۔ (۲/۲۱۳) یعنی ایک دوسرے کی ضد سے مخالفت کرنا۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے کے خلاف کفر کا فتویٰ اسی مقصد کے لئے لگاتا ہے۔

(۳) افراد کے خلاف کفر کے فتوے کا جذبہ حسد ہوتا ہے۔ چنانچہ امام غزالیؒ اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ۔

جس شخص پر لوگ حسد کریں اسے حقیر جانیں۔ اور جس کو کافر اور گمراہ نہ کہیں اس کو ناچیز سمجھو۔

(بحوالہ حیات جاوید صفحہ ۶۴۷)

چنانچہ جن افراد پر کفر کے فتوے لگے ہیں آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے دور کی ممتاز شخصیتیں تھیں اور ان کا جرم یہی تھا کہ وہ اپنے معصروں سے کہیں آگے تھے۔ مذہبی پیشوائیت صرف ان لوگوں سے راضی رہ سکتی ہے جن کی ذہنی سطح ان سے نیچی یا (زیادہ سے زیادہ) ان کے برابر ہو۔ یعنی جو یا تو آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے پیچھے چلتا جائے، یا انہی جیسا سوچے اور انہی کی طرح بات کرے۔ جونہی کسی نے ان سے بلند سطح پر سوچنا سمجھنا شروع کیا، ان کے دل میں حسد کے جذبات اُبھرے۔ کفر و ارتداد کے فتوے انہی جذبات حسد و بغض کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ آپ اُس فہرست پر نگاہ ڈالئے جو اوپر دی گئی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ شخصیتیں اپنے معصروں کے مقابلہ میں کس قدر بلند تھیں۔ اور ان کی بلندی کا ثبوت یہ ہے کہ آج (مثلاً) امام اعظمؒ۔ امام ابن تیمیہؒ۔ شاہ ولی اللہؒ۔ سرسیدؒ۔ اقبالؒ کا نام تاریخ کے صفحات پر درخشندہ موتیوں کی طرح چمکتا ہے اور جن لوگوں نے ان کے خلاف کفر کے فتوے لگائے تھے، انہیں کوئی جاننا پہچاننا بھی نہیں۔

کن باتوں پر کفر کا فتویٰ لگایا جاتا ہے

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم نے مومن ہونے کے لئے یہ مطالبہ پیش کیا ہے کہ وہ شخص

اللہ۔ انبیاء۔ کتب۔ ملائکہ۔ اور آخرت

پر ایمان رکھے۔ آپ کے دل میں یہ خیال گزرتا ہوگا کہ جن لوگوں پر کفر کے فتوے لگائے گئے تھے۔ وہ ان اجزائے ایمان میں سے کسی کا انکار کرتے ہونگے! بالکل نہیں۔ یہ حضرات خدا کی ہستی پر ایمان رکھتے تھے۔ قرآن کریم سے پہلے کی تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے تھے اور قرآن کو خدا کی آخری کتاب مانتے تھے۔ نبی اکرمؐ سے پہلے کے تمام انبیاء کرامؑ پر ایمان رکھتے تھے، اور نبی اکرمؐ کو خدا کا آخری نبی مانتے تھے۔ ملائکہ پر اور مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان

رکھتے تھے۔ اِس کے بعد آپ یقیناً حیران ہونگے کہ وہ کون سی باتیں ہیں جن کی بنا پر ان کے خلاف کفر کے فتوے لگ جاتے تھے۔ سنیئے کہ وہ کون سی باتیں ہیں۔ مثلاً

(۱) اگر کوئی کہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تو وہ کافر ہے۔

(۲) اگر کہے کہ معدوم شے اللہ کو معلوم نہیں تو کافر۔

(۳) اگر کہے کہ میں جنوں سے معلوم کر کے خبر دیتا ہوں تو کافر۔

(۴) اگر کہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ آدم علیہ السلام نبی تھے یا نہیں تو کافر۔

(۵) اگر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا انکار کرے تو کافر۔

(۶) اگر کسی کافر نے مسلمان سے کہا کہ مجھ پر اسلام پیش کر۔ اس نے کہا کہ فلاں مولوی کے پاس جا تو کافر ہو گیا۔ (فقہ اکبر۔ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۶۴)

(۷) اگر کسی مسلمان سے کہا گیا کہ کیا تو مومن ہے۔ اس نے کہا مجھے معلوم نہیں تو کافر۔

(۸) جس نے کسی عالم سے بغیر سبب ظاہری کے بغض رکھا وہ کافر ہے۔

(۹) استخفاف علماء بالاتفاق علماء کفر ہے۔ (صفحہ ۱۵۶۰ فقہ اکبر)

(۱۰) جس مسلمان نے (بطور ڈرامہ) اپنے آپ کو معلم اور استاد بنا لیا اور پھر ہاتھ میں سونٹا لے کر بچوں کو مارا تو کافر ہو گیا۔

(۱۱) اگر کسی مسلمان نے دوسرے مسلمان سے کہا کہ چلو، فلاں مجلس وعظ میں چلیں۔ اس نے کہا جو باتیں وہاں مولوی صاحب بتاتے ہیں ان پر عمل کون کر سکتا ہے۔ یا کہا مجھے ایسی مجلس سے کیا تعلق؟ تو کافر ہو گیا۔

(۱۲) اگر کسی نے کسی سے کہا تو مجلس وعظ میں نہ جا۔ اگر جائیگا تو تیری بیوی تجھ پر حرام ہو جائے گی یا تجھے طلاق ہو جائیگی۔ اگر ہنسی کے طور پر ایسا کہا تو کافر ہو گیا۔

(۱۳) اگر کسی عورت نے کسی عالم خاوند پر لعنت کی تو کافر ہو گئی۔

(۱۴) جس نے کسی عالم کو عویلم (یعنی چھوٹے مولوی صاحب یا مولوی شولوی) کہہ دیا تو کافر ہو گیا۔ (صفحہ ۱۵۷۔ فقہ اکبر)

(۱۵) اگر کسی نے کسی دوسرے سے کہا خدا کے واسطے یہ کام کر۔ اس نے کہا نہیں کرتا تو کافر ہو گیا۔ (صفحہ ۱۴۷۔ فقہ اکبر)

(۱۶) علم اور علماء سے ہنسی کرنا کفر ہے۔

(۱۷) اگر کوئی اپنے غیر مسلم استاد کو یعنی (مجوسی یا ہندو عیسائی ماسٹر کو) عزت کے طور پر استاذی یعنے اے میرے استاد کہہ دے تو کافر ہو جائے گا۔ (جیسا کہ صلوٰۃ ظہیریہ میں ہے)

(۱۸) اگر کسی ذمی کی ٹوپی اپنے سر پر رکھے اور اس سے اس کی غرض گرمی سردی دور نہ کرنا ہو تو کافر۔

(۱۹) اگر کوئی ٹیچر یا ماسٹر کہے کہ یہود (یعنی غیر مسلم ہندو وغیرہ) مسلمانوں سے بہت اچھے ہیں کیونکہ وہ اپنے استادوں کا حق ادا کرتے ہیں تو کافر۔

(۲۰) اگر کہے کہ عیسائیت یہودیت سے اچھی ہے تو کافر۔

(۲۱) اگر کہے عیسائیت مجوسیت سے اچھی ہے تو کافر۔

(۲۲) اگر کہے ایمان بڑھتا ہے اور گھٹتا ہے تو کافر۔

غرضیکہ اس داستان کو کہاں تک طول دیا جائے۔

جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے آپ اس پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کوئی مسلمان بھی ایسا ہے، جو ان فتووں کی رُو سے کافر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ایک اہم سوال

اس مقام پر ایک اہم سوال سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ ان حضرات کو (یا کسی اور کو) یہ اختیار کہاں سے مل جاتی ہے کہ وہ کسی کے کفر اور اسلام کا فیصلہ کریں؟ "علماء" کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے کسی مذہبی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ تو کیا ان کتابوں کے پڑھ لینے سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ جسے جی چاہے کافر قرار دیدے؟ باقی رہے مفتی۔ سو اسلامی سلطنت میں یہ ایک منصب تھا جس پر کوئی شخص حکومت کی طرف سے تعینات ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی مفتی نہیں ہوتا تھا جس طرح آج کل ایڈووکیٹ جنرل۔ یا اٹارنی جنرل حکومت کی طرف سے تعینات ہوتے ہیں اور ہر وکیل اپنے آپ کو نہ ایڈووکیٹ جنرل قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اس منصب کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ مفتی کی حیثیت مشیرِ قانونی کی ہوتی تھی۔ اس کا کام صرف مشورہ یا رائے دینا تھا۔ فیصلہ کرنا نہیں تھا۔ فیصلہ حکومت خود کرتی تھی یا اس کی طرف سے مقرر کردہ قاضی۔ اب نہ وہ حکومتیں باقی ہیں، نہ ان کی طرف سے مقرر کردہ مفتی۔ لیکن یہ حضرات ابھی تک اپنے آپ کو انہی معنوں میں مفتی سمجھتے ہیں، اور صرف مفتی کے فرائض ہی سرانجام نہیں دیتے، بلکہ قاضی کی حیثیت سے فیصلے بھی صادر کرتے ہیں۔

اصل جرم کیا ہے؟

— ایک اور سوال بھی قابلِ غور ہے۔ ایک غیر مسلم جب اسلام لانا چاہتا ہے، تو

اس سے صرف اس کا اقرار لیا جاتا ہے کہ وہ

اللہ۔ ملائکہ۔ انبیاء۔ کتب۔ اور آخرت

پر ایمان لاتا ہے۔ اس اقرار سے وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اسلام کے متعلق کچھ علم حاصل کرتا ہے۔ کچھ غور و فکر کرتا ہے۔ پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ (مثلاً) ملائکہ سے مراد یہ ہے۔ آخرت کا مفہوم کچھ اس قسم کا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس سے اس پر کفر کا فتوے لگا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ جن امور کو ماننے سے وہ کافر سے مسلمان ہوا تھا، انہیں وہ اب بھی مانتا ہے۔ اس غور و فکر سے وہ اس مقام سے آگے بڑھا ہے۔ پیچھے نہیں ہٹا۔ لیکن اس وقت وہ مسلمان تھا اور اب وہ کافر ہو گیا۔ گویا جب وہ اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا تو وہ مسلمان تھا، اور جب اس نے اسلام کے متعلق کچھ سیکھا اور اس پر غور و فکر کیا تو وہ کافر ہو گیا، حالانکہ اس نے ان اجزائے ایمان میں نہ کسی قسم کی تخفیف کی ہے، نہ ان میں اضافہ کیا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس کے غور و فکر کے نتائج سے متفق نہیں، وہ آپ کے نزدیک غلط ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس سے کافر کیسے ہو گیا!

اور پیدائشی مسلمان سے کبھی اتنا اقرار بھی نہیں لیا جاتا جتنا نو مسلم سے لیا جاتا ہے۔ نہ ہی اس سے کبھی یہ پوچھا جاتا ہے کہ وہ ملائکہ کو کس انداز سے مانتا ہے اور آخرت کے متعلق کیا سمجھتا ہے۔ ان میں سے بھی جو کبھی ان امور پر غور و فکر کرنے لگے اس پر کفر کے فتوے لگتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ یہ ساری مصیبت اس پر آتی ہے جو دین میں غور و فکر کرنے لگے۔ کافر وہی بنتا ہے۔ اگر کوئی ایسا نہ کرے تو ان حضرات کو، اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہوتی۔

کتنے مسلمان بنائے

جیسا کہ ہم شروع میں بتا چکے ہیں نبی اکرمؐ (اور صحابہ کبارؓ) نے ہزار مصیبتیں اٹھا کر اور لاکھ تکلیفیں جھیل کر کافروں کو مسلمان بنایا۔ اور یہی دین کی خدمت تھی۔ یہ حضرات جو بیک جنبش قلم و حرکت زبان، ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کو کافر بنا دیتے ہیں، ان سے پوچھیے کہ انہوں نے ساری عمر میں کتنے کافروں کو مسلمان بنایا! کافروں کو مسلمان بنانے کے لئے بڑی محنت درکار ہوتی ہے۔ مسلمان کو کافر قرار دینے میں لگتا ہی کیا ہے؟ اس لئے ان حضرات کے نزدیک جہاد نام ہے مسلمانوں کو کافر قرار دینے کا۔ اے کاش! ان تک کوئی اقبالؒ کا یہ پیغام پہنچا سکتا کہ

لشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے!
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اِن فتووں کا اثر

یہ ظاہر ہے کہ وہ فرقہ یا شخص جس کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا جاتا ہے، ان کے فتویٰ کی رُو سے کافر تو نہیں ہو جاتا لیکن اس سے ملک کا امن ضرور تباہ ہو جاتا ہے۔ فتوے صادر کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ہنگامے برپا ہوتے ہیں، فساد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ملت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ بھائی سے بھائی اور باپ سے بیٹا جدا ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ سیدھے سادے عوام سچ مچ سمجھ لیتے ہیں کہ اُس فرقے کے لوگ کافر اور مرتد ہو گئے ہیں۔ فتوے میں لکھا ہوتا ہے کہ

(۱) ان کی بیویاں ان پر حرام ہو چکی ہیں۔

(۲) ان کے ساتھ بیاہ شادی حرام ہے۔

(۳) ان کے ساتھ ملنا جلنا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ معاشرتی روابط رکھنا، سب ناجائز ہیں۔

(۴) ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جا سکتی۔

(۵) انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکتا۔

(۶) یہ واجب القتل ہیں۔

غور کیجئے کہ جب عوام بچارے ان امور کو شریعت کا فیصلہ سمجھ کر ان پر عمل کرنے لگ جائیں تو ملک اور ملت کی حالت کیا ہو جائے گی! لیکن جب یہ ہنگامے فرو ہو جاتے ہیں تو خود وہ حضرات جنہوں نے اس قسم کا فتویٰ دیا تھا، ان لوگوں کے ساتھ، جن کے خلاف یہ فتویٰ دیا گیا تھا، اُسی طرح ملتے جلتے ہیں۔ ان کی شادی بیاہ میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ وہ بدستور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوتے ہیں۔ یعنی ان فتووں کا عملی نتیجہ، سوائے ہنگامے برپا کرنے اور مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ لڑانے کے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ سوچئے کہ جس قوم میں یہ صورتِ حالات مسلسل جاری رہے، اس کا حشر کیا ہوگا؟

شاھد من اھلھا

اس فتوے بازی اور کافر گری نے امت کے ساتھ کیا کیا ہے، اس کیلئے ہم مودودی صاحب کی کتاب "تفہیمات، حصہ دوم" کا ایک اقتباس دے دینا کافی سمجھتے ہیں۔ وہ اس میں "فتنۂ تکفیر" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

> مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں جہاں اور بہت سے فتنے پیدا ہوئے ہیں وہاں ایک بڑا اور خطرناک فتنہ ایک دوسرے کو کافر اور فاسق ٹھیرانے اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا بھی ہے۔ لوگوں نے اسلام کے سیدھے سادے عقائد میں موشگافیاں کیں اور قیاس و تاویل سے ان کے اندر بہت

سے ایسے فروع اور جزئیات پیدا کر لئے جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے اور جن کی کوئی تصریح کتاب وسنت میں نہ تھی۔ یا اگر تھی بھی تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی پھر ان اللہ کے بندوں نے (اللہ انہیں معاف فرمائے) اپنے وضع کردہ فروعی مسائل کے ساتھ اتنا اہتمام کیا کہ انہی پر ایمان کا مدار ٹھہرا دیا۔ ان کی بنیاد پر اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، بیسیوں فرقے بنا دیئے اور ہر فرقے نے ایک دوسرے کو کافر، فاسق، گمراہ، دوزخی اور خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ حالانکہ کفر و اسلام کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین میں ایک واضح خط امتیاز کھینچ دیا تھا اور کسی کو یہ حق نہ دیا تھا کہ اپنے اختیار سے جس چیز کو چاہے کفر اور جسے چاہے اسلام ٹھہرا لے۔ اس فتنے کی بنیاد خواہ تنگ نظری ہو نیک نیتی کے ساتھ، یا خود غرضی اور حسد اور نفسانیت ہو بدنیتی کے ساتھ، بہرحال اس نے مسلمانوں کی جماعت کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، شاید کسی اور چیز نے نہیں پہنچایا۔

(۰)

آئینی پہلو

یہاں تک تو اس سوال کا صرف "مذہبی" پہلو سامنے آیا ہے۔ لیکن پاکستان میں اس کا ایک آئینی پہلو بھی ہے۔ ہمارے مطالبہ پاکستان کی بنیاد یہ تھی (اور یہ بنیاد ہمارے دین کا تقاضا تھا) کہ مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر غیر مسلموں سے ایک الگ قومیت کے افراد ہیں۔ ہم نے ابھی پاکستانی قوم کی یہ تعریف (DEFINITION) اپنے آئین میں نہیں رکھی۔ لیکن اس میں یہ تو درج ہے کہ صدر کے منصب کے لئے امیدوار کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ "مسلمان" کی تعریف آئین میں نہیں دی گئی۔ اسلئے (جیسا کہ ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا) کل کو جب صدر کے انتخاب کا موقعہ آیا تو یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ امیدوار اپنا مسلمان ہونا ثابت کرے۔ وہ اپنا جو عقیدہ بھی بیان کرے گا اس کے خلاف کفر کا فتوے پہلے سے موجود ہوگا۔ اسلئے یہ سوال بڑی دشواری پیدا کر دیگا کہ وہ امیدوار "مسلمان ہونے کی شرط" پوری کرتا ہے یا نہیں۔

"منیر کمیٹی" نے اس نکتہ کو اس سے بھی آگے بڑھایا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ جس فرقہ کو کافر ٹھہرایا جاتا ہے، اس سے وابستہ افراد کو واجب القتل بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ

اگر (مثلاً) مولانا احسان یا میرزا احمد رضا خان، رئیس مملکت ہو جائیں، تو وہ مولانا محمد شفیع صاحب (دیوبندی) یا مولانا داؤد غزنوی صاحب (اہلحدیث) کے قتل کا حکم صادر فرمائیں گے

اور اگر مولانا محمد شفیع صاحب رئیس مملکت ہو گئے تو وہ ان تمام لوگوں کو جو دیو بندیوں کو کافر قرار دیتے ہیں، واجب القتل قرار دیں گے .... یعنی شیعہ، سنی۔ دیوبندی، اہلحدیث بریلوی میں سے جس جماعت کے ہاتھ میں اقتدار ہوگا، اس کے نزدیک باقی سب واجب القتل ہوں گے۔ (صفحہ ۲۱۹)

(۷)

ہم قوم کے اہل فکر طبقہ سے جنہوں نے (اور جن کی آنے والی نسلوں نے) اس ملک میں زندگی گذارنی ہے، دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ مسئلہ ایسا نہیں جس پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے اور ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے ملک اس قسم کے انتشار سے محفوظ رہے اور مسلمانوں میں نفرت، عداوت اور تفرقہ کے بجائے محبت، اخوت اور اتحاد کی فضا پیدا ہو۔ اسی سے ہمارے پنپنے کی شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ ورنہ ان فتوے بازیوں اور دشنام طرازیوں نے قوانت کو تباہ کر رکھا ہے۔

(ج)

ضرورت رشتہ

۱۔ ایک نہایت شریف، گھریلو، کشمیری (ڈار) برادری کی ناکتخدا لڑکی کے لئے، جو ایم۔ ایس۔ سی۔ (M.Sc.) کر چکی ہے، ایک علم دوست سلیم الطبع۔ برسر روزگار لڑکے کا رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکے کے لئے کسی خاص برادری سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ عمر تیس بتیس سال تک ہو۔

خط وکتابت:۔ (د۔ ل) معرفت ادارہ .....

۲۔ ایک نہایت شریف گھرانے کی سلیقہ شعار ناکتخدا لڑکی کے لئے جو بی۔ اے (B.A.) کر چکی ہے ایک تعلیم یافتہ اور فکر قرآنی کے شائق، برسر روزگار لڑکے کے رشتہ کی ضرورت ہے۔ عمر پچیس تیس سال کے درمیان ہو۔

خط وکتابت:۔ (ص) معرفت ادارہ ....

۳۔ ایک نہایت شریف گھریلو، شیخ برادری کی ناکتخدا لڑکی کے لئے، جس کی تعلیم انڈر میٹرک ہے، ایک موزوں برسر روزگار رشتہ درکار ہے، لڑکے کی عمر پینتیس سال سے زائد نہ ہو۔

خط وکتابت:۔ (ع۔ ص) معرفت ادارہ .....

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

اپنے بزرگوں کی باتیں سُنیئے

● امام ابن الجوزیؒ چھٹی صدی کے جلیل القدر علماء میں سے ہیں۔ بغداد میں رہتے تھے۔ آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے خطیب اور بہت سے علوم حدیث و تفسیر و فقہ اور ادب و تاریخ وغیرہ میں بے مثال تھے۔ آپ کی تصانیف مختلف علوم میں تین سو چالیس سے زیادہ ہیں۔ ان میں سے بعض اس قدر مبسوط ہیں کہ بیس جلدوں تک پہنچ گئیں۔ کل مجلدات کی تعداد دو ہزار ہے۔ ان کے ہاتھ پر ایک لاکھ آدمیوں نے توبہ کی اور بیس ہزار یہودیوں اور نصرانیوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ منقول ہے کہ جن قلموں سے آپ احادیث رسولؐ اللہ لکھتے تھے ان کے تراشے محفوظ رکھتے تھے تو ان کا ایک انبار لگ گیا۔ آپ نے وصیت یہ کی تھی کہ میرے انتقال کے بعد جب غسل دیا جائے تو اس سے پانی گرم کیا جائے۔ چنانچہ ایسا کیا گیا تو پھر بھی اس کا ایک حصہ بچ گیا۔ آپ کی وفات بغداد میں ۵۹۷ھ میں ہوئی۔[1]

انہی امام ابن الجوزیؒ کی ایک تصنیف ہے جس کا نام ہے "کتاب الاذکیا" (اذکیا، ذکی کی جمع۔ یعنی نہایت ذہین اور عقلمند حضرات) اس میں انہوں نے "ذکاوت و ذہانت کے مختلف الانواع نمونے پیش فرمائے ہیں اور انبیاء علیہم السلام سے لے کر اولیاء۔ بزرگان۔ صلحاء۔ ادباء۔ شعراء۔ رؤسا۔ ارباب صنعت و حرفت۔ قضاۃ۔ والیانِ ملک۔ عوام۔ حتیٰ کہ بدوضع طبقات تک کے مزاح و خوش طبعی اور ذکاوت کے مقالات اور معاملات کے نمونے ابواب و فصول پر منقسم کر کے یک جا کر دیئے ہیں جن سے مختلف اہل کمال کی رسا عقلوں، ذہانتوں، طباعیوں اور زندہ دلی کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں اور عقلوں کو مختلف معنوی راہوں میں گھومنے پھرنے کی راہیں ملتی ہیں۔ یہ کتاب فی الحقیقت تاریخ بھی ہے اور کند عقلوں کی غباوت دور کرنے کے لئے ایک اکسیری علاج بھی ہے جس سے مردہ عقل میں تیزی اور امنگ پیدا ہو جاتی ہے ..... انہوں نے مزاحی حکایات لکھ کر کسی بدعت کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ سنن صالحین کو بجا کیا اور اسوۂ حسنہ کی ضروری تفصیلات

---

[1] مقدمہ کتاب، از مترجم ـــ مولانا اشتیاق احمد صاحب دیوبندی۔

جمع کی ہیں جو بدعت نہیں، تقویتِ سنت ہے۔"

یہ اقتباس ہے کتاب الاذکیا کے اردو ترجمہ کے پیش لفظ کا جسے "فخر العلماء حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند نے تحریر فرمایا ہے۔ جہاں تک مزاح کے سنت ہونے کا تعلق ہے، اس پیش لفظ میں تحریر ہے۔

> اسلام دینِ فطرت ہے جو کسی بھی انسانی جذبہ کو مٹانے یا پامال کرنے نہیں آیا بلکہ ٹھکانے لگانے آیا ہے۔ اس نے ان جذبات تک کو بھی یکسر فنا کرنا نہیں چاہا جو عرفِ عام بلکہ عقولِ عامہ میں معصیت سمجھے جاتے ہیں اور فی نفسہ ہیں بھی معصیت۔ جیسے جھوٹ۔ دھوکہ۔ لوٹ مار۔ چوری۔ قتل و غارت اور اترا ہٹ وغیرہ۔ لیکن ان کو اس نے مٹانے کے بجائے مناسب مقام پر استعمال کرنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ وہ بتلائی ہوئی حدود کے اندر استعمال ہوں۔ مثلاً اصلاحِ ذات البین کے لئے جھوٹ، حربیوں کی جنگ میں دھوکہ۔ جہاد و قصاص میں قتل و غارت۔ غاصبوں کے ہاتھ سے اپنا مال نکالنے کے لئے چوری۔ متکبروں اور مغروروں کے مقابل صوری اتراہٹ وغیرہ امور کو صرف جائز ہی نہیں رکھا بلکہ اعلیٰ ترین طاعت و قربت قرار دیا ہے۔

یہ ضمنی بات تھی، جہاں تک زیرِ نظر کتاب کی اہمیت کا تعلق ہے، قاری طیب صاحب، اپنے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں کہ "عرصہ دراز گذرا کہ میں نے بھی اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور اکثر سفر و حضر میں یہ کتاب الاذکیا میرے ساتھ رہتی تھی۔ کئی بار بطور آرزو یہ خطرہ گزرا کہ کاش اس کا ترجمہ ہو جائے۔ الحمد للہ کہ ایک عرصہ کے بعد اس خواب کی تعبیر ترجمہ کتاب الاذکیا کی صورت میں سامنے آ رہی ہے۔ اس لئے ترجمہ اور تکمیلِ آرزو کی دوہری خوشی میسر آئی۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ تم بالترجمہ۔

مصنف کتاب کے پایہ کی بلندی سے آپ واقف ہو گئے، ان کی کتاب کا تعارف آپ نے دیکھ لیا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب، مہتمم دارالعلوم دیوبند کی نگاہوں میں اس کی کیا اہمیت ہے، اس کا بھی آپ نے اندازہ لگا لیا، وہ اس کتاب کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ اگر اس کے بعد بھی ہم اپنے قارئین کو ان جواہر پاروں کے استفادہ سے محروم رکھیں تو سوچئے کہ یہ کس قدر بخیلی ہوگی۔ کتاب میں سات سو علمی لطائف ہیں، ہم ان میں سے صرف معدودے چند پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔" اس سلسلہ میں ہم اتنا گزارش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان نوادرات میں سے جنہیں حضرات انبیاء کرامؑ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، ان کے بعد ہماری طرف سے "معاذ اللہ۔ صد بار معاذ اللہ" کے ندامتی الفاظ کا اضافہ کر لیجئے۔

کہ ہم انہیں بالکل وضعی سمجھتے ہیں۔ اس معذرت کے بعد آپ "کتاب الاذکیا" کے جواہر پاروں کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ ہر اقتباس کے بعد کتاب کے صفحہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جسے "امتیاز احمد۔ مالک اشتیاق بک ڈپو، دیوبند" نے شائع کیا ہے۔ اور اس کا تیسرا ایڈیشن (اگست ۱۹۶۵ء) ہمارے سامنے ہے۔

———(۰)———

۱۔ عقلمند کی نشانی

موٹی گردن دلالت کرتی ہے دماغی قوت اور اس کی زیادتی پر۔　　(صفحہ ۲۸)

۲۔ ملّتِ اسلامیہ کے مؤسسِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ

"حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی نسبت منقول ہے حضرت ابن عباس سے کہ جب حضرت سارہ نے دیکھا کہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ (ہاجرہ) سے حضرت ابراہیمؑ محبت کرنے لگے تو ان کے دل میں شدید غیرت پیدا ہوئی یہانتک کہ وہ قسم کھا بیٹھیں کہ وہ ہاجرہ کے اعضا میں سے کوئی عضو ضرور کاٹ دیں گی جب یہ اطلاع حضرت ہاجرہ کو پہنچی، تو انہوں نے زرہ پہننا شروع کردی جس کے دامن طویل رکھے اور یہ دنیا کی پہلی عورت ہیں جس نے دامن لمبا بنایا۔ اور ایسا اسلئے کیا تھا کہ چلتے ہوئے دامن کی رگڑ سے قدموں کے نشانات زمین پر باقی نہ رہیں کہ سارہ ان کے آنے جانے کو نہ پہچان سکیں۔

ابراہیمؑ نے سارہ سے فرمایا کہ کیا تم یہ خیر حاصل کر سکتی ہو کہ اللہ کے فیصلہ پر اپنے کو راضی کرلو اور ہاجرہ کا خیال چھوڑ دو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے جو قسم کھائی ہے اب اس سے عہدہ برآ ہونا کیسے ممکن ہوگا۔ آپ نے اسکی ترکیب یہ بتائی کہ تم ہاجرہ کے پوشیدہ جسم کے اوپر کا حصہ گوشت (کا جو ایک مستقل عضو ہے) کاٹ دو (اس کا کاٹ دینا عورتوں کے لئے اچھا بھی ہے اور) عورتوں میں یہ ایک سنت جاری ہو جائے گی اور تمہاری قسم بھی پوری ہو جائے گی۔ تو وہ اس پر رضامند ہو گئیں اور اس کو کاٹ دیا اور یہ طریقہ عورتوں میں جاری ہو گیا۔ (اس طرح عورتوں کی ختنہ کا رواج عرب میں تھا۔ اسلام نے اسکو ضروری نہیں قرار دیا جس طرح مردوں کی ختنہ ضروری ہے)۔"　(صفحہ ۳۱)

۳۔ اور آپکے صاحبزادہ حضرت اسماعیلؑ

حضرت ابن عباس نے مروی ہے کہ جب حضرت اسمٰعیلؑ جوان ہو گئے تو آپ نے قوم جرہم کی ایک عورت سے نکاح کر لیا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیلؑ سے ملنے کے لئے (شام سے) آئے تو اسمٰعیل کو نہ پایا

تو آپ نے ان کی بیوی سے پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ معاش کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں۔ پھر اس سے معاشی حالات دریافت کئے تو اس نے کہا کہ ہم بڑی تنگی اور سختی سے گزارا کرتے ہیں اور شکایتیں کرنا شروع کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب تمہارا شوہر آئے تو اس سے ہمارا سلام کہہ دینا اور یہ کہ اپنے گھر کے دروازہ کی دہلیز بدل دے۔ جب حضرت اسمٰعیل واپس آئے تو انہوں نے سب پیغام پہنچا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ میرے والد (حضرت ابراہیمؑ) تھے اور مجھے یہ حکم دے گئے ہیں کہ میں تجھے اپنے سے جدا کر دوں۔ اب تو اپنے متعلقین کے پاس چلی جا۔ مؤلف کا قول ہے کہ یہ حدیث حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اعلیٰ دیانت پر بھی دلالت کرتی ہے۔" (صفحہ ۳۱ ۔ نمبر ۴)

۴۔ ذکاوتِ سلیمانی

"محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت سلیمانؑ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے نبی اللہ! میرے پڑوس میں ایسے لوگ ہیں جو میری بطخ چراتے ہیں۔ پھر آپ نے نماز کے لئے اعلان کرایا (سب لوگ حاضر ہو گئے)۔ پھر آپ نے خطبہ دیا جس کے دوران میں فرمایا۔ تم میں ایک شخص اپنے پڑوسی کی بطخ چوری کرتا ہے اور ایسی حالت میں مسجد میں آتا ہے کہ اس کا پَر اس کے سر پر ہوتا ہے۔ یہ سنکر چور نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دیکھ کر آپ نے حکم دیا کہ پکڑ لو اس کو یہی وہ چور ہے۔" (صفحہ ۳۳ ۔ نمبر ۸)

۵۔ رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ

"حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز میں کسی کو حدث ہو جائے یعنی گوز نکل کر وضو ٹوٹ جائے تو اپنی ناک پکڑ کر جماعت سے نکل جائے۔ (ناک پکڑنے کو اس حالت کی علامت قرار دے دیا۔ ورنہ جماعت کے سامنے سے نکلنے میں بڑا فتنہ پیدا ہو جاتا۔)" (صفحہ ۳۹ ۔ نمبر ۱۶)

۶۔ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے پاس کپڑوں کے کچھ جوڑے تھے جن کو آپ نے لوگوں پر تقسیم کرنا چاہا۔ ان میں ایک جوڑا خراب تھا۔ آپ نے سوچا اسے کیا کروں۔ یہ جس کو دونگا وہ اس کے عیب دیکھ کر لینے سے انکار کر دیگا۔ آپ نے اس کو لیا اور تہ کر کے اپنی نشست گاہ کے نیچے رکھ لیا اور اس کا تھوڑا سا پلّہ باہر نکال دیا۔ دوسرے جوڑوں کو سامنے رکھ کر لوگوں کو تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اب زبیر بن العوام آئے اور آپ تقسیم میں لگے ہوئے اور اس جوڑے کو دبائے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس جوڑے کو گھورنا شروع کر دیا۔ پھر بولے یہ جوڑا کیسا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تم اس کو چھوڑو وہ پھر بولے۔ یہ کیا ہے یہ کیا ہے۔ اس میں کیا وصف ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تم اس کا خیال چھوڑو۔ اب انہوں نے

مطالبہ کیا کہ یہ مجھے دو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تم اسے پسند نہیں کروگے۔ زبیرؓ نے کہا کہ میں نے پسند کرلیا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے پختہ اقرار کرالیا اور یہ شرط کرلی کہ اسے قبول کرنا ہوگا اور پھر واپسی نہ ہوسکیگی۔ تو نیچے سے نکال کر ان پر ڈالدیا۔ جب زبیرؓ نے اس کو لیکر دیکھا تو وہ ردی نکلا تو کہنے لگے۔ میں تو اس کو لینا نہیں چاہتا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا بس بس! اب ہم آپ کے حصہ سے فارغ ہوچکے۔ اس کو ان ہی کے حصہ میں لگایا اور واپس لینے سے انکار کردیا۔ (یاد رہے کہ یہ فروخت کرنے کا معاملہ نہ تھا۔ اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ اگر مال میں کوئی عیب ہو تو خریدار پر اسکو واضح کردیا جائے۔ یہ تو مفت تقسیم کا معاملہ تھا)۔" (صفحہ ۳۳ - نمبر ۲۲)

۷۔ "روایت ہے کہ ایک شخص حضرت علیؓ کے سامنے حاضر کیا گیا جس نے یہ حلف کرلیا تھا کہ میری بیوی پر تین طلاق اگر میں رمضان میں اس سے دن میں جماع نہ کروں۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر سفر میں چلا جا اور دوران سفر میں روزہ فرض نہیں اسلئے روزہ نہ رکھنا اور دن میں جماع کرلینا۔" (صفحہ ۴۷ - نمبر ۳۰)

۸۔ "عبداللہ بن رواحہ کے بارے میں عکرمہ مولیٰ ابن عباس کہتے ہیں کہ عبداللہ بن رواحہ اپنی بیوی کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر وہاں سے حجرے کیطرف پہنچے (جہاں ان کی باندی موجود تھی) اس سے مشغول ہوگئے۔ جب ان کی بیوی نے بیدار ہوکر ان کو نہ دیکھا تو تجسس کے لئے نکلی اور دیکھا کہ وہ جاریہ یعنی باندی کے پیٹ پر ہیں تو اس نے واپس ہوکر چھری سنبھالی اور جاریہ کے پاس پہنچی۔ عبداللہ نے اس سے کہا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا۔ کیا بات کیسی، سمجھ لو میں اگر اس وقت تم کو اس حالت میں پھر دیکھ لیتی جس میں تم تھے تو اس چھری سے اس کی خبر لیتی۔ عبداللہ نے کہا۔ اور میں کہاں تھا؟ اس نے کہا۔ اس جاریہ کے پیٹ پر۔ عبداللہ نے کہا میں کہاں تھا۔ (انہوں نے ایک ایسا لفظ بولا جس سے اس عورت کو انکار مفہوم ہوا) اس نے کہا کیوں نہیں۔ کہنے لگی۔ اچھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حالت جنابت میں قرآن پڑھنے سے منع کیا۔ اگر تم سچے ہو تو قرآن پڑھکر سناؤ۔ انہوں نے کہا۔ اچھا سنو۔ اور قرآن کے لہجہ میں یہ اشعار پڑھ ڈالے۔

(اشعار حذف کردیئے گئے ہیں۔)

اس نے (قرآن سمجھ کر) کہا میں اللہ پر ایمان لائی اور میری آنکھیں جھوٹی۔ کہتے ہیں کہ جب صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا عرض کیا۔ آپ سنکر اتنا ہنسے کہ آپ کے دندان مبارک ظاہر ہوگئے۔

(صفحہ ۴۹ - نمبر ۲۷)

۹۔ خزیمہ بن ثابت کے متعلق زہری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ آپ اس کو ساتھ لے کر چلے تاکہ اس کی قیمت اس کو ادا کردیں۔ آپ کی رفتار تیز تھی اور اعرابی آہستہ چل رہا تھا۔ (اسلئے آپ اس سے کچھ دور آگے ہوگئے تھے) لوگوں نے (یہ دیکھ کر کہ ایک بکاؤ گھوڑا ہے) اس اعرابی کو روک کر

اُس سے قیمت طے کرنا شروع کر دی۔ ان کو یہ خبر نہ تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس سے خرید چکے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اُس قیمت سے جو حضورؐ سے طے ہو چکی تھی زیادہ قیمت لگا دی، تو اس اعرابی نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو آواز دی اور کہا اگر تمہارا اسکو خریدنے کا ارادہ ہے تو خرید لو نہیں تو میں اس کو بیچتا ہوں۔ یہ سُنکر آپ کھڑے ہو گئے اور آپ نے فرمایا۔ کیا میں تجھ سے خرید نہیں چکا ہوں۔ اس نے کہا۔ نہیں۔ اب لوگ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور اعرابی کے گرد جمع ہو گئے جبکہ دونوں ایک دوسرے سے سوال و جواب کر رہے تھے۔ اب اعرابی نے یہ کہنا شروع کیا کہ کوئی گواہ لاؤ جو یہ شہادت دے کہ میں نے آپ کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اور مسلمانوں میں سے جو شخص بھی آ رہا، وہ اعرابی سے کہتا رہا کہ کمبخت اللہ کے رسول ہمیشہ سچ ہی فرماتے ہیں یہاں تک کہ خزیمہ آ گئے۔ انہوں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور اعرابی کے ایک دوسرے سے سوال و جواب سنے۔ اس اعرابی نے پھر یہی کہنا شروع کر دیا کہ کوئی گواہ لاؤ جو یہ گواہی دے کہ میں بیچ چکا ہوں۔ خزیمہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو بیچ چکا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خزیمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم کس بنا پر گواہی دے رہے ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے صادق ہونے کی بنا پر، اے اللہ کے رسولؐ! اس وقت سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے تنہا خزیمہ کی شہادت دو مردوں کے برابر قرار دی۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خزیمہ سے فرمایا۔ تم کیسے گواہی دیتے ہو تم کیسے گواہی دیتے ہو۔ تم تو ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ انہوں نے کہا۔ یا رسولؐ اللہ! جب آپ آسمان کی خبریں دیتے ہیں (صرف آپکے سنکر ہی) تو ہم آپ کی تصدیق کرتے ہیں تو اس قول کی تصدیق کیوں نہ کریں (اسی ذہانت کے مشاہدہ پر آپ نے خزیمہ کی شہادت کو دو مردوں کے برابر قرار دیا۔ (صفحہ ۵۔ نمبر ۴)

خلفاء کے متعلق

۱۔ منصورؓ[ع] کے متعلق اسماعیل بن محمد سے منقول ہے کہ ابن ہرمہ شاعر نے ابوجعفر (منصور) کو ایک قصیدہ سنایا۔ منصور نے کہا۔ اپنی حاجت مانگو۔ اس نے کہا۔ آپ اپنے مدینہ کے عامل کو یہ لکھ دیجئے کہ جب وہ مجھے نشہ میں پائے تو مجھ پر حد جاری نہ کرے۔ تو منصور نے کہا یہ تو ایک حد ہے (جو اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے)۔ اس کے باطل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ ابن ہرمہ نے کہا کہ میری حاجت اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ منصور نے کہا۔ اچھا ہم اپنے مدینہ کے عامل کو یہ لکھ دیتے ہیں کہ جو کوئی ابن ہرمہ کو پکڑ کر لائے اور وہ نشہ میں ہو تو ابن ہرمہ کو اسّی دُرّے مارو اور جو اس کو پکڑ کر لائے اس کو سَو۔ راوی کہتا ہے کہ سنتری (یعنی پولیس والے) ابن ہرمہ کو جب وہ نشہ میں ہوتا تھا، دیکھتے ہوئے گذر جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اسّی کوڑوں کے بدلے سو کوڑے کون خریدے۔ وہ گذر جاتے اور اس کو چھوڑ جاتے تھے۔ (صفحہ ۶۹۔ نمبر ۵۶)

ع یہ سفاح کا بھائی تھا۔ سفاح کے انتقال کے بعد خلیفہ ہوا۔ ۱۲

بیوی (بیچاری) پر طلاق

۱۱۔ "دو آدمی ایک بکری کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ ہر ایک نے اس کا ایک ایک کان پکڑ رکھا تھا۔ اس دوران میں ایک شخص آ گیا۔ دونوں نے اس سے کہا، جو فیصلہ تم کر دو گے وہ ہمیں منظور ہو گا۔ اس نے کہا۔ اگر تم میرے فیصلہ پر راضی ہو تو ہر ایک یہ حلف کرے کہ اگر وہ میرا فیصلہ نہ مانے گا تو اس کی بیوی پر طلاق ہے۔ تو دونوں نے ایسا حلف کر لیا۔ پھر اس نے کہا۔ اب اس کے کان چھوڑ دو تو دونوں نے چھوڑ دیئے۔ اب اس نے اس کا کان پکڑا، اور لے کر چلتا بنا (کہ اس کا فیصلہ یہی تھا) دونوں دیکھتے رہ گئے۔ اس سے بات کرنے پر بھی قادر نہ رہے۔ (کہ اگر ناراضی کا اظہار کرتے ہیں تو بکری کے ساتھ بیوی بھی جاتی گی۔)" (صفحہ ۱۳۶۔ نمبر ۱۴)

امام نخعی کا حیلہ

۱۲۔ "علی بن ہاشم نے ایک شخص سے روایت کیا جس کا نام بھی لیا تھا کہ جب ہم ابراہیم نخعی کے پاس سے آیا کرتے تھے تو ہم سے کہا کرتے تھے کہ اگر میرے بارے میں تم سے پوچھا جائے تو کہہ دینا کہ ہمیں خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ (اس میں جھوٹ لازم نہیں آئے گا) کیونکہ جب تم میرے پاس سے چلے گئے تو پھر تم کو کیا خبر ہو سکتی ہے کہ میں کہاں ہوتا ہوں (نماز کی جگہ، کھانے کی جگہ، آرام کی جگہ، بیت الخلاء، گھر میں بہت سی جگہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ایسا کہہ دینا غلط نہیں ہو سکتا۔)" (صفحہ ۱۳۵۔ نمبر ۱۴)

دونوں میں کمال

۱۳۔ "ہشام بن الکلبی کے بارے میں محمد بن ابی السری کہتے ہیں کہ مجھ سے ہشام بن الکلبی نے کہا کہ میں نے حفظ بھی ایسا کیا کہ کسی نے ایسا نہ کیا ہو گا اور مجھ سے بھول بھی ایسی ہوئی جو کسی سے نہ ہوئی ہو گی۔ میرے چچا ایسے تھے کہ مجھ پر حفظِ قرآن سے خفا ہوتے تھے تو میں ایک گھر میں داخل ہوا اور قسم کھائی کہ جب تک پورا قرآن حفظ نہ کر لوں گا، گھر سے نہ نکلوں گا تو میں نے قرآن کو تین دن میں حفظ کر لیا۔ (نسیان کا یہ واقعہ پیش آیا کہ) ایک دن میں نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ (چونکہ ڈاڑھی زیادہ بڑھ گئی تھی) میں نے اس کو مٹھی میں پکڑا تا کہ باہر بڑھے ہوئے بالوں کو مٹھی کے نیچے سے کاٹ دوں لیکن مٹھی کے اوپر کا حصہ کاٹ دیا۔" (صفحہ ۱۵۱۔ نمبر ۱۷)

شرعی حیلے

ہماری فقہ کی کتابوں میں ایک باب الحیل بھی ہوتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ

قانون شکنی کے باوجود قانون کی زد سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ایسے بہت سے حیلے دیئے گئے ہیں جو بالعموم طلاق سے متعلق ہیں۔ دو ایک آپ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

۱۴۔ "حرملہ بن یحییٰ کہتے ہیں کہ میرے سامنے امام شافعی سے ایک شخص نے سوال کیا کہ میری بیوی کے پاس ایک کھجور تھی۔ میں نے اس کو یہ کہہ دیا کہ اگر تو نے یہ کھجور کھالی تو تجھ پر طلاق، اور اس کو پھینک دیا تب بھی طلاق۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آدھی کھالے اور آدھی پھینک دے (مقولہ مؤلف) ایک روایت میں یہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے امام شافعی سے امام احمد بن حنبل نے بھی روایت کیا اور ہمارے اصحاب نے اس جنس کے بہت سے مسائل ذکر کئے ہیں جن کے جواب پر کوئی بہت ذہین مفتی ہی آگاہ ہو سکتا ہے۔ ہم ان میں سے چند مسائل کا یہاں ذکر کرتے ہیں کیونکہ ایسی چیزیں ایک سمجھدار کے لئے بہت مفید ہوتی ہیں۔" (صفحہ ۱۵۰۔ نمبر ۱۷۳)

۱۵۔ "اگر ایسی صورت واقع ہو کہ عورت سیڑھی پر ہے اور اس سے شوہر نے کہا کہ اگر تو اس سیڑھی پر چڑھی یا اس سے نیچے اتری تو نے اپنے آپ کو نیچے گرایا یا کسی نے نیچے اتارا تو تجھ پر طلاق ہے تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ وہ دوسری سیڑھی پر منتقل ہو جائے۔ (جو اس سیڑھی کے برابر رکھ دی جائے)" (صفحہ ۱۵۱۔ نمبر ۱۷۵)

۱۶۔ "ایک شخص نے اپنی بیوی کے پاس ایک برتن دیکھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس نے بیوی سے کہا کہ یہ مجھے پلا دے۔ اس نے انکار کر دیا تو اس نے حلف بالطلاق کیا کہ نہ تو اس پانی کو پی سکتی ہے اور نہ گرا سکتی ہے اور نہ برتن میں باقی چھوڑ سکتی ہے اور نہ کوئی ایسی ہی اور صورت اختیار کر سکتی ہے (مثلاً یہ کہ کسی دوسرے کو پلا دے) تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ برتن میں کوئی ایسا کپڑا ڈالا جائے جو پانی پی جائے پھر اس کو دھوپ میں سکھا لیا جائے۔"

(صفحہ ۱۵۲۔ نمبر ۱۸۲)

۱۷۔ "کسی کے دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے ایک بالاخانہ میں ہے اور دوسری نیچے گھر میں ہے۔ شوہر نے سیڑھی پر چڑھنا شروع کیا تو دونوں بیویوں نے اپنے اپنے پاس آنے پر اصرار شروع کر دیا۔ اس شخص نے قسم کھائی کہ نہ میں اوپر چڑھ کر تیرے پاس آؤں گا اور نہ نیچے اتر کر تیرے پاس آؤں گا اور نہ اس جگہ اس ساعت میں ٹھہروں گا۔ تو چاہیئے کہ نیچے کے گھر والی اوپر چڑھ آوے اور اوپر والی اتر کر اس کے پاس آجائے۔ اب اس کو اختیار ہے کہ دونوں میں سے جس کے ساتھ چاہے چلا جائے۔" (صفحہ ۱۵۳۔ نمبر ۱۸۴)

۱۸۔ اگر اپنی زوجہ سے حلف کیا کہ میں تیرے گھر میں بوریہ نہیں لاؤں گا اور تجھ سے جماع بوریہ پر ہی کروں گا، پھر اس نے گھر میں جماع بھی کر لیا اور قسم بھی نہ ٹوٹی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بوریہ کا سامان گھر میں لے آوے اور کاریگر کو بلا کر گھر میں ہی بوریہ بنوالے اور اس پر جماع کرے۔"

(صفحہ ۱۵۳۔ نمبر ۱۸۵)

ایک دفعہ مسلمان ہو جا پھر دیکھا جائیگا!

۱۹۔ "ایک نصرانی ضحاک بن مزاحم کے پاس آتا جاتا تھا۔ انہوں نے اس سے ایک دن کہا کہ تو اسلام کیوں نہیں لاتا۔ اس نے کہا۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ مجھے شراب بہت پسند ہے اور میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ انہوں نے کہا اسلام لے آ اور پیا کر۔ یہ اسلام لے آیا پھر اس سے ضحاک نے کہا۔ اب تو مسلمان ہو چکا ہے اگر تو نے شراب پی تو ہم تجھ پر حد جاری کر دیں گے اور اگر اسلام سے پھرا تو تجھے قتل کر دینگے۔" (صفحہ ۳۰۱۔ نمبر ۴۵۷)

یہ فریب دہی تھوڑی ہے؟

۲۰۔ "عبداللہ بن الزبیرؓ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ جانیکا قصد کیا اور ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے تو وہ اپنے ساتھ اپنا تمام مال جو پانچ یا چھ ہزار درہم تھا' اٹھا لے گئے، تو میرے پاس میرے دادا ابو قحافہ آئے اور ان کی بینائی جاتی رہی تھی اور کہنے لگے کہ میں اس کو (یعنی ابوبکر کو) دیکھتا ہوں کہ واللہ اس نے اپنی جان کے ساتھ اپنے مال کو لیجا کر بھی تم کو دکھ پہنچایا ہے۔ میں نے کہا۔ اے ابا ہرگز نہیں انہوں نے ہمارے لئے بہت سا مال چھوڑا ہے اور اسماء نے کچھ پتھر کے ٹکڑے اٹھا کر ان کو گھر کے اس طاق میں رکھ دیا جس میں ابوبکر اپنا مال رکھتے تھے اور ان پتھر کے ٹکڑوں پر ایک کپڑا ڈھک دیا تھا۔ اسماء کہتی ہیں پھر میں ابو قحافہ کے پاس گئی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کپڑے پر رکھ دیا اور ان سے میں نے کہا ابوبکرؓ نے ہمارے لئے یہ چھوڑا۔ تو انہوں نے کپڑے کے اوپر ہی سے پتھروں کو ٹٹول کر دیکھا۔ پھر بولے جب وہ تمہارے لئے یہ چھوڑ گئے تو بہتر ہے اور واللہ انہوں نے ہمارے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا تھا۔ نہ کم اور نہ زیادہ۔"

(صفحہ ۴۰۹۔ نمبر ۵۷۶)

جانوروں کی ذکاوت

۲۱۔ "ابوسعید روایت کرتے ہیں ابوہریرہؓ سے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مکھی کے دونوں پروں میں سے ایک میں بیماری ہے اور دوسرے میں شفا ہے اور وہ اپنا بچاؤ اس طرف کے پر سے کرتی ہے جس میں بیماری ہے۔ (یعنی جب کسی شے پر گرتی ہے تو اس طرف سے گرتی ہے) تو جب وہ تمہارے کسی کے برتن میں گر جائے (جس میں شوربہ وغیرہ ہو) تو چاہیئے کہ اسے پوری کو غوطہ دو پھر نکال کر پھینک دو۔ (یہ مکھی کی ذکاوت ہے کہ وہ اچھے حصے کو نقصان سے بچانا چاہتی ہے)۔"

(صفحہ ۴۵۹۔ نمبر ۶۲۵)

ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "شہد کی مکھیوں کے چھتے سیلابوں کے جھاگ سے بنے ہوتے ہیں"۔ (صفحہ ۴۳)

(۱)

یہ ہیں چند ایک نمونے ان نوادرات کے جن پر ابن الجوزی جیسے جید امام اور محدث کی نگہ انتخاب پڑی ہے اور جسے اس نے اس "بلند پایہ کتاب" میں جمع کر دیا ہے جسے قاری محمد طیب جیسے (دورِ حاضرہ کے معلم ملّم) سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور جس کے ترجمہ پر وہ مترجم کو خدا کے ہاں سے صلہ اور معاوضہ کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ کتاب کا بیشتر حصہ جنسی فواحشات سے مملو ہے — اور یہ اسی کتاب کی خصوصیت نہیں ہمارے قدیم لٹریچر کی اکثر یہی حالت ہے — وہ واقعات ایسے شرمناک ہیں کہ ہم انہیں طلوعِ اسلام میں درج کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ لیکن چونکہ قارئین اس کا اندازہ نہیں کر سکتے جب تک کوئی مثال سامنے نہ لائی جائے، اسلئے ہم (بصد معذرت و ندامت) دو ایک ایسے اقتباسات درج کرتے ہیں جو نسبتاً عریاں ہیں۔

حیا کی آنکھیں جھک جاتی ہیں

۲۲۔ "ایک عورت کا ایک آشنا تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک تو کوئی ایسا حیلہ نہیں کرے گی کہ میں تیرے شوہر کے روبرو تجھ سے جماع کروں، میں تجھ سے بات نہ کرونگا۔ اس نے ایسا حیلہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اس کا ایک دن مقرر ہو گیا۔ اور ان کے گھر میں ایک بہت لمبا کھجور کا درخت تھا۔ اس عورت نے اپنے شوہر سے کہا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کھجور پر چڑھ کر کھجوریں اپنے ہاتھ سے توڑ کر کھاؤں۔ اس نے کہا، ایسا کر لے۔ جب وہ بالکل چوٹی پر چڑھ گئی تو اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر بولی کہ ہائیں یہ تو غیر عورت کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ بڑا افسوس ہے تجھے شرم نہیں آتی کہ میری موجودگی میں تو اس سے جماع میں مشغول ہے اور گالیاں دیتی اور چیختی رہی اور وہ قسم کھاتا رہا کہ میں تو یہاں اکیلا ہوں۔ یہاں کوئی دوسرا موجود بھی نہیں۔ پھر اتر کر اس سے جھگڑتی رہی اور وہ حلف بالطلاق کرتا رہا کہ وہ بالکل اکیلا تھا۔ پھر اس نے عورت سے کہا کہ تو بیٹھ میں اوپر چڑھ کر دیکھتا ہوں۔ جب وہ درخت کی چوٹی پر پہنچ گیا، اس نے اپنے آشنا کو بلا لیا۔ اس نے اس سے منہ کالا کرنا شروع کر دیا۔ شوہر نے اوپر سے جب نیچے یہ حال دیکھا تو اس نے بیوی سے کہا۔ میں تیرے قربان، اپنے دل میں اس بات کا کچھ رنج مت رکھ جو تو نے میرے بارے میں بیان کی تھی۔ جو بھی اس درخت پر چڑھے گا وہ ایسا ہی دیکھے گا جیسا کہ تو نے دیکھا تھا۔ (اور اب میں بھی تجھے اسی طرح دیکھ رہا ہوں)" (صفحہ ۲۰۶۔ نمبر ۲۶۲)۔ (الاذکیاء۔ دالحفیظ)

۲۳۔ اور غیرت منہ پھیر لیتی ہے

جاحظ نے بیان کیا کہ بصرہ میں ایک مخنث کچھ لوگوں کے پاس

(باقی صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ ہو)

خورشید عالم

استعمار کا عالمی کردار (۵)

دنیا کا نقشہ سامنے رکھ کر اس پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ منظر واضح طور پر دکھائی دینے لگے گا کہ اس کا شمالی حصہ جو جاپان سے شروع ہو کر روس اور یورپ اور انگلستان سے ہوتا ہوا امریکہ تک پھیلا ہوا ہے، ترقی یافتہ اور امیر ہے۔ اس کے برعکس جنوبی حصہ جو ایشیا اور افریقہ سے ہوتا ہوا جنوبی امریکہ تک محیط ہے، بالعموم پسماندہ ہے۔ شمالی نصف کرے کو بجا طور پر دنیا کا شہر کہا گیا ہے اور جنوبی نصف کرے کو دنیا کا گاؤں۔ شہر اور گاؤں کا تصور پیش نظر رکھا جائے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ دونوں نصف کرے زندگی کی دوڑ میں کہاں تک پہنچے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ دونوں نصف کرے ایک دوسرے کو متاثر کرتے اور باہمی کوشش سے اس تفاوت کو دور کرتے جس نے ایک کو شہر اور دوسرے کو گاؤں بنا دیا۔ اس تعاون کی طرح پڑتی تو اول تو یہ تفاوت پیدا ہی نہ ہوتا اور اگر تاریخ کے کسی دور میں پیدا ہو بھی جاتا تو اگلے دور میں رفع ہو گیا ہوتا۔ ہوا دراصل اس کے بالکل برعکس۔ شمالی کرے کی ساری ترقی اور امارت جنوبی کرے کے دم سے ہے۔ جنوبی کرے کو لوٹ لوٹ کے شمالی کرے نے اپنا گھر بھرا۔ وہ اب بھی اپنے گھر کو بھرے رکھنا چاہتا ہے اور اسی فکر اور کوشش میں ہے کہ گاؤں اس کے پیچھے پڑا اور اس کا دست نگر رہے، اور پہلے کی طرح اس کا گھر بھرتا جائے اور اپنی خانہ بربادی کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کے یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ جائے اور بیٹھا رہے، کہ نہ آج کا خیال ہو نہ کل کی پرواہ۔ اسی کو استعمار کہتے ہیں اور یہی دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ امریکہ اسی کا علمبردار ہے اور وہ لعنت کے اسی طوق کو پوری انسانیت کے گلے میں ڈالنے اور ڈالے رکھنے کے لئے ہر طرح کوشاں ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔

استعمار نے اضطراب، خلفشار اور تصادم کی جو عالمگیر صورت پیدا کر دی ہے وہ دلچسپ مطالعہ ہے۔ یہ صورت قوموں قوموں کے اندر بھی ہے اور قوموں قوموں کے درمیان بھی ہے۔ دست مشیت کچھ اس تیزی سے سرگرم کار ہو گیا ہے کہ قومی اور بین الاقوامی یعنی داخلی اور خارجی تطہیر کے سامان ساتھ ساتھ ہوتے جا رہے ہیں۔ نصف کرۂ جنوبی کو پھر سامنے لائیے۔ جیسا کہ ان صفحات پر متفرق عنوانات کے تحت گفتگو ہوتی چلی آئی ہے،

آزادی کی پُرجوش مجاہدانہ تحریکوں نے جہاں بہت سے ممالک کو سیاسی غلامی سے نجات دلا دی ہے وہاں کئی علاقوں میں تحریکِ آزادی ابھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سے اب تک کم و بیش چوالیس ممالک آزاد ہو چکے ہیں لیکن ابھی اندازاً ساڑھے تین کروڑ انسان بدستور غلام ہیں۔ ان کے غلام رہنے کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں مؤثر تحریکِ آزادی نہیں چل سکی بلکہ بڑی وجہ یہ ہے کہ سامراج کے لیڈر کی حیثیت سے امریکہ ان یورپی قوموں کی پشت پناہی کر رہا ہے جو ان انسانوں پر مسلط ہیں۔ کوشش ایک طرف یہ ہو رہی ہے کہ جو علاقے سامراج کے تصرف میں ہیں وہ آسانی سے آزاد نہ ہوں اور دوسری طرف یہ کہ جو علاقے آزاد ہو گئے ہیں وہ آزادی کردار سے استعمار کے اثر و اختیار کے دائرہ سے باہر نہ نکل جائیں۔ غلام ممالک میں سامراج کتنی مضبوطی سے ہی قدم کیوں نہ جمائے یہ ایک نہ ایک دن اکھڑ جائیں گے۔ ان کی آزادی وقت کی بات ہے اور یہ حاصل ہو کے رہے گی۔ اصل مسئلہ ان کی آزادی کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد آزادی کیسے برقرار رکھی جائے اور اسے کس طرح معاشرے کی تشکیلِ نو کے لئے استعمال کیا جائے کہ استعمار نے استحصال اور استبداد کے جو کانٹے کشتِ معاشرہ کے طول و عرض میں بو رکھے ہیں، ان کی بیخ کنی ہو جائے اور افراد معاشرہ کی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار آ کر معاشرتی فلاح و بہبود کی ضامن ہو سکیں۔

سامراج نے اس کا کئی ایک پہلوؤں سے انتظام کیا کہ آزادی سے یہ راز نہ کھل سکے کہ ہر قوم اور ملک کی اصل دولت اور طاقت اس کے عوام ہیں۔ ہر قسم کی ترقی ان کے دست و بازو کی مرہونِ منت ہو گی اور استعماری سرمائے، مشینوں اور اسلحہ سے قومی زندگی کے راستے رکیں گے اور سوتے خشک ہوں گے۔ اس کے لئے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، وہ نظامِ سیاسی و معاشی رائج و راسخ کیا گیا جو مبنی بر استحصال ہے تا کہ غیر ملکی حکمران چلے جائیں تو ملکی حکمران ان کی جگہ لے کر اہلِ ملک کا استحصال کریں اور اپنے استحکام اور تحفظ کے لئے سامراج کے دست نگر ہوں۔ یہ عقیدہ عام طور پر ذہن نشین کرایا گیا کہ مغرب کا نظامِ سیاسی و معاشی ہی انسانی کشود کا واحد ذریعہ ہے۔ نو آزاد ممالک کو ممنونِ احسان کرنے کے لئے ان کی کئی طرح سے "امداد" کی گئی۔ ان کڑی شرطوں پر قرضے دیئے گئے، ان کا خام مال اونے پونے خریدا گیا۔ اپنی مشینیں مہنگے داموں ان کو مہیا کی گئیں۔ نام نہاد ماہرین شہزادے بنا کے بھیجے گئے۔ کوئی بنیادی صنعت ان کے ہاں لگنے نہیں دی گئی۔ اس سب اور بہت کچھ کو 'امداد' کا نام دیا گیا۔ اور تقاضا کر کرکے اپنا شکریہ ادا کرایا گیا۔ یہ اہتمام صرف اسلئے تھا اور ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی کوئی ملک سامراج کے گرداب سے نہ نکل سکے۔ یہ تدبیریں اپنی جگہ رنگ ضرور لائیں اور لا رہی ہیں۔ لیکن دستِ قطرت نے استعمار کے گریبانوں کو ایسا چاک کرنا شروع کر دیا ہے کہ سامراج کا جو بھنور تقدیر کا بہانہ دکھائی دیتا تھا، اس کی گرہ بھی کھلنے پر آ گئی ہے۔ گو یہ حقیقت ہے کہ نو آزاد ممالک میں بڑی یا بڑے پیمانے پر صنعتیں بالعموم نہیں لگیں لیکن جتنا کچھ ہوا ہے اس سے کئی سربستہ راز کھلنے لگ گئے ہیں۔ شہروں میں صنعتی کارکنوں کا ایک

نیا طبقہ معرضِ وجود میں آگیا ہے۔ یہ طبقہ روز بروز بڑھ رہا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام سے براہ راست متاثر ہے۔ ان کے سامنے کارخانے داروں نے گوشۂ گمنامی سے نکل کر کارخانے لگائے اور ان کے دیکھتے دیکھتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ پورے ملک کی دولت چند کارخانے داروں کے تصرف میں آگئی۔ اس کے برعکس ان کے اپنے ساتھ جو کچھ ہوا' اور ہو رہا ہے' وہ یہ ہے کہ خون پسینہ ایک کرنے کے بعد یہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتے۔ لباس۔ رہائش۔ تعلیم۔ علاج وغیرہ جیسی بنیادی ضروریات کے لئے انہیں دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں اور کوئی بات نہیں بنتی۔ ان کارکنوں میں بہت سے لوگ دیہات سے آئے ہیں۔ دیہات میں ان کی زندگی اجیرن تھی تو وہ بھاگ آئے وہاں سے۔ شہروں میں وہ ایک اور عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں تو یہاں سے کہاں جائیں! ان میں سے بعض کے بچے سکولوں اور کالجوں میں پہنچے تو عصری خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے خاندانوں کو گرفتارِ بلا دیکھا تو ان کے سینے خلش و ہیجان سے بھر دیئے گئے۔

سینوں میں اضطراب بڑھتا اور بھرتا گیا تو ایک ایک دو دو کر کے یہ لوگ عام اضطرار میں گلیوں، کوچوں، اور بازاروں میں آگئے۔ یوں قطرہ دریا بن گیا، دریا میں طوفان آگیا۔ یہ کسی ایک ملک میں نہیں ہوا ملکوں ملکوں میں ہوا، ہونے لگا اور ہو رہا ہے۔ استعمار نے جو سبق صدیوں سے ان کے ذہن نشین کر رکھا تھا اسے زندگی کے حقائق نے یکسر رد کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن بات پھر بھی صاف نہیں ہوئی، ہونے دی نہیں جا رہی۔ مغرب کے سامراج کے خلاف سیاسی طور پر رائے عامہ تو عالمی سطح پر بیدار ہوئی لیکن اس سے تو غلامی کی یہی صورت کافی سمجھی گئی کہ سیاسی طور پر آزادی حاصل کر لی جائے اور بس۔ سیاسی آزادی، استعمار کے استیصال کی تمہید ضرور ہے اس کی کافی صورت نہیں۔ استعمار کے استیصال کی مؤثر صورت روس کے اشتراکی انقلاب نے پیدا کی۔ اس تجربے کے متعلق اور کچھ بھی کہا جائے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے استعمار پر کاری ضرب اس طرح لگائی کہ اپنے ہاں استعماری نظمِ سیاسی و معاشی کی بساط الٹ کے رکھ دی اور ایسی نئی طرح ڈالی جس سے اقتدار ان طبقات معاشرہ میں منتقل ہونے لگا جو صدیوں سے زیردست، پامال اور پسماندہ چلے آ رہے تھے۔ ان طبقات کے ابھرنے سے یہ توقع پیدا ہوئی کہ وہ طبقات زبردست اور کم اثر ہوتے جائینگے جو مفادِ خصوصی کی بنا پر استعمار کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ اس تجربے میں بجا طور پر روس سے باہر دلچسپی لی جانے لگی اور دوسرے ملکوں میں ایسے گروہ اور افراد ابھرنے لگے جنہیں اس میں اتنی دلکشی دکھائی دینے لگی کہ وہ اسے اپنے ہاں آزمانے پر کمربستہ ہونے لگے۔ ایک غیر سرمایہ دارانہ نظام ہی استعمار کو للکار سکتا تھا اور جڑ سے اکھاڑنے کا ضامن ہو سکتا تھا۔ استعمار اتنا بڑا حادثہ کسی طور برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے روس کے اشتراکی تجربے کو خوب خوب رسوا کیا غالباً اب بھی وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ روس اپنے تجربے میں ضرورت سے زیادہ الجھا ہوا ہونے کی وجہ سے خاموش

رہا یا واقعی اس کے تجربے کے ایسے پہلو تھے جس کی وہ پردہ داری کرنا چاہتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں اس تجربے کے خلاف مواد مہیا کیا گیا اور اسے مخصوص رنگ میں پیش کیا گیا۔ یوں اشتراکیت کو شجر ممنوعہ بنا دیا گیا۔ اس کی بازگشت اب تک سنائی دے رہی ہے کہ اشتراکی ادب کا داخلہ یہاں روکا جائے وہاں روکا جائے۔ مغرب سے اخلاق سوز مواد آیا، آتا رہا اور آرہا ہے۔ جملہ مذاہب کے خلاف خرافات کا سیلاب کبھی نہیں تھما۔ یہ استعمار مغرب کا کمال ہے کہ ننگی اور فحش تصویروں تک کے خلاف بھی خفیف سی آواز ہی اٹھائی جا سکی۔ اس کے برعکس مارکس، لینن، سٹالین، ماؤ کی کتابوں کو درسگاہوں میں داخل نہیں ہونے دیا گیا اور یہ واویلا بڑے اونچے سُروں میں ہوتے رہتا ہے کہ ان کو ممنوع قرار دیا جائے۔ یہ واویلا اٹھانے کے لئے ان طبقات تک رسائی حاصل کی گئی جو نظریات کی سرحدوں اور ان کی تقدیس کا دم بھرتے ہیں لیکن "ثمن قلیل" کے لئے ان کے بیع و شری پر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ان طبقات نے نہ اشتراکی لٹریچر پڑھا نہ اپنے حلقے میں وہ اسے دیکھنے ہی کے روادار ہوتے ہیں لیکن استعماری ذرائع سے ان کی جیبیں بھی بھری جاتی ہیں اور دماغ بھی بھرے جاتے ہیں۔

اشتراکیت کسی غیر اشتراکی ملک کے لئے کس حد تک مفید ہو سکتی ہے، اس کا فیصلہ ہر ملک اپنے حالات کے مطابق کر سکتا ہے اور اسے کرنے دینا چاہیئے لیکن استعمار نے نو آزاد ملکوں کے اندر بیٹھ کر ایک ایسی دیوار کھڑی کرنی شروع کر دی ہے جو بظاہر اشتراکیت کے سیلاب کو روکنے کا بہانہ ہے لیکن دراصل وہ استعمار کا قلعہ تعمیر کر کے اس طریقے سے اسے محفوظ بنا رہا ہے۔ اس سے نو آزاد ممالک میں یہ سوچ ابھاری جا رہی ہے کہ ان کا اصل مسئلہ سرمایہ دارانہ نظام کو چلانا ہے نہ یہ کہ وہ معاشرے کی تشکیل نو کریں اور ان طبقات کو بے اثر بنائیں جو آسانی سے استعمار کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور معاشرے میں مفاسد ہی مفاسد پیدا کرتے ہیں۔ آج بیشتر نو آزاد ممالک ایک عجیب بحران سے دوچار ہیں۔ مغرب کا جو نظم سیاسی انہیں ورثے میں ملا اسے چلانے کے لئے انہوں نے بڑے جتن کر دیکھے۔ کئی ممالک میں فوج تک کو مداخلت کرنی پڑی لیکن کشود کار کہیں نہیں ہو سکی۔ کہیں آئین کا رونا، کہیں انتخاب کی رٹ۔ کہیں طرزِ حکومت کی موشگافیاں۔ بات کہیں نہیں بنتی۔ بنے کیسے؟ سوچ کے پاؤں میں استعمار نے گردش پرکار پیدا کر دی ہے۔ سوچ کا قدم ہر پھر کے استعمار کے دائرے ہی میں پڑ سکتا ہے۔ استعمار نے کان میں پھونک دیا ہے کہ سوچ کی سیتا اس دائرے سے باہر نکلی تو اشتراکیت کا راون اسے اچک لے جائے گا۔ یہ سوال اشتراکیت کا نہیں، استعمار سے گلو خلاصی کا ہے۔ استعمار یہ نوبت نہیں آنے دینا چاہتا کہ گرفتارانِ استعمار پر پھڑپھڑا کر اُڑ جانے کے قابل ہو سکیں۔ وہ پروں کی ہلکی سی جنبش پر بھی اشتراکیت کی دہائی دینے لگتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر غیر استعماری سوچ اشتراکیت ہے۔ نو آزاد ممالک کو اب جرأت سے فیصلہ کرنا ہو گا اور اپنا انتخاب کرنا ہو گا۔ وہ سوچنے پر آ گئے تو انہیں صاف دکھائی دینے لگے گا کہ انتخاب استعمار اور اشتراکیت میں نہیں۔ انہیں

فیصلہ صرف یہ کرنا ہے کہ استعمار کے نظمِ استحصال و استبداد کو خیرباد کہہ کے ایسا معاشرتی نظام رائج کرنا ہے جو عمرانی اور معاشی انصاف کا ضامن ہو۔ استعمار سے کچھ نام کیوں نہ دے اصل مسئلہ معاشرے کی تشکیلِ نو اور معاشرتی اور معاشی انصاف کا رواج ہے۔

استعمار نے یوں تو نوآزاد ممالک میں سوچ کے سوتے گدلے کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن حالات کی رَو ایسی ہو چلی ہے کہ خود اس کے اپنے سوچ کے سوتے صاف ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ سوچ کی تطہیر کی تکمیل شاید اس کے بغیر ہو بھی نہ سکے۔ استعمار کے علمبردار کی حیثیت سے امریکہ کی ساری کوشش یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام رائج اور قبول رہے' اور یہ صرف امریکہ یا ان مغربی ممالک تک ہی محدود نہ رہے جن کا وہ پشت پناہ ہے' بلکہ جنوبی نصف کرے میں بھی اسی نظام ہی کا چلن رہے۔ امریکہ دیکھ رہا ہے' اور حالات اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر چکے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام انسان کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ یہ نظام یکسر ناکام ہو چکا ہے اور زمانہ اسے رد کر چکا ہے۔ اس لاش کو چند ے اور اٹھائے اٹھائے پھرا جا سکتا ہے لیکن زمانہ تا دیر جنازہ بردوش نہیں رہ سکتا۔ امریکہ دنیا بھر کو باور کرا رہا ہے کہ یہ لاش نہیں زندہ نظام ہے۔ جہاں دلیل یعنی تلبیس سے کام نہیں چلتا وہاں وہ معاشی اور عسکری حربے اور قوت استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ رونا اس کا سارا یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف یا اس سے ہٹ کر جو بات بھی کی جائے گی وہ اشتراکیت سے مختلف نہیں ہوگی' اور اشتراکیت ایسی لعنت ہے جو انسانی خودی کے منافی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام سے ہٹنے کی معمولی سے معمولی کوشش کو بھی امریکہ اشتراکیت کا نام دے کر نوآزاد ممالک کو اس لئے ڈرا رہا ہے کہ ایک بار ان ممالک نے معاشرے کی تشکیلِ نو کی طرح ڈال دی تو وہ کوئی سا راستہ ہی کیوں نہ اختیار کریں' سرمایہ دارانہ نظام کو وہ بہرطور خیرباد کہہ دیں گے۔ امریکہ جانتا ہے کہ ان ممالک سے سرمایہ دارانہ نظام رخصت ہونے لگا تو ان پر اس کا اپنا اثر و اقتدار ختم ہو جائیگا' اور اس کا اثر و اقتدار ختم ہؤا تو خود اپنے ہاں یہ نظام برقرار نہیں رہ سکے گا ——— اور وہ شہر نہیں رہے گا کاؤں بن جائے گا۔

امریکہ کی یہ سوچ کتنی کج اور اس کی حرکات کس قدر بیہودہ ہیں' اس کا اندازہ اس خلفشار سے لگایا جا سکتا ہے جو خود امریکہ اور اس کے زیرِ اثر استعماری ملکوں میں پیدا ہی نہیں ہو گیا بلکہ تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ امریکہ نے صنعتی اعتبار سے حیران کن ترقی کی ہے۔ وہاں صنعتی اور کاروباری سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں اور ایسے افراد اور خاندان ابھر آئے ہیں جو کروڑوں نہیں اربوں اور کھربوں ڈالروں کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ سلطنتیں معرضِ وجود میں آنے اور پھیلنے لگیں تو زیادہ سے زیادہ افراد کو معاش اور روزگار کے مواقع ملنے لگے۔ گو چوٹی کے چند افراد ناقابلِ تصور دولت کے مالک بنتے چلے گئے تاہم عام بے روزگار اور تہی دست بھی مقابلتاً آسودہ اور خوشحال

ہوتے گئے۔ اس ابتدائی مرحلے میں امریکی معاشرے میں خوشحالی کا چلن دکھائی دینے لگا اور نچلے طبقات بھی خوش اور مطمئن دکھائی دینے لگے تو امریکہ بڑے فخر سے اپنے آپ کو تونگر اور خوشحال معاشرہ کہنے اور کہلانے لگا۔ لیکن ایک وقت آیا جب سرمایہ داری کا منافع تو چند ہاتھوں میں محدود ہو کے رہ گیا اور اس کا نقصان بے شمار افراد کو پہنچنے لگا جو ابتدائی مرحلے میں آسودہ ہو گئے تھے۔ ان کارکنوں نے قدرتی طور پر احتجاج کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح معاشرے میں بے چینی پھیلنے لگی۔ اب امریکی معاشرے میں دولت کی ریل پیل تو ہے لیکن اس میں پہلی سی آسودگی نہیں رہی۔ الٹا معاشرتی فضا عمومی ہیجان و اضطراب سے معمور ہو گئی ہے۔ سرمایہ و محنت کا تصادم وہاں شدید سے شدید تر ہو گیا ہے۔ صرف پچھلے سال میں جو صنعتی ہڑتالیں ہوئیں ان کی تعداد پانچ ہزار بتائی جاتی ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ ۱۹۶۰ء سے پہلے چودہ سالوں میں کوئی پندرہ کروڑ افراد نے ہڑتالوں میں شرکت کی۔ لیکن ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۸ء تک کے نو سالوں میں ہڑتالی افراد کی تعداد تیس کروڑ تک پہنچ گئی۔ یہ ہڑتالی کارکن ابھی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نہیں ہوئے۔ ان کے مطالبے تنخواہوں اور مراعات میں اضافے ہی کے ہوتے ہیں لیکن روز افزوں احتجاجی مظاہرے اس کا ثبوت ہیں کہ محنت کش پریشان ہی نہیں دن بدن پریشان تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ مظاہرے امریکہ کے لئے بہت بڑا دردِ سر بن چکے ہیں اور گو محنت کشوں کے مطالبات مان کر ان کی اشک شوئی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن وہ وقت دور نہیں جب اشک شوئی نہ سرمایہ داروں کے لئے ممکن رہے گی، نہ اشک شوئی سے محنت کشوں کو قابلِ ذکر فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس وقت سرمایہ داروں کی تو نہیں لیکن محنت کشوں کی آنکھیں کھلیں گی کہ ان کی اصل مصیبت یہ نہیں کہ انہیں معاوضہ یا مشاہرہ کم ملتا ہے بلکہ یہ ہے کہ ان کا معاشی اور معاشرتی نظام ہی استبداد اور استحصال پر قائم ہے۔ اور جب تک یہ نظام قائم ہے ان کی مشکل آسان نہیں ہو سکتی۔ نوبت یہاں تک پہنچے گی تو سرمایہ و محنت میں تصادم کی وہ صورت سامنے آئے گی کہ اصحابِ سرمایہ و اقتدار پوری قوت سے محنت کشوں کا مقابلہ کریں گے اور انہیں کچلیں گے۔ یہ تصادم خون ریز ہو گا لیکن اس سے امریکہ کے نظامِ سرمایہ داری کی فصد کھلے گی اور معاشرے کے مزاج میں اصلاح ہونے کا امکان پیدا ہو گا۔

امریکی معاشرے میں ہیجان و اضطراب کی وجہ صنعتی میدان ہی میں نہیں دکھائی دیتی بلکہ صنعتی کارکنوں کے مقابلے میں ایک اور طبقہ کہیں زیادہ مضطرب اور مشتعل ہو چکا ہے۔ یہ طبقہ سیاہ فام باشندوں کا ہے جو اولاد ہیں ان غلاموں کی جو اہل یورپ افریقہ سے جانوروں کی طرح ہانک ہانک کے لائے تھے اور جن کی محنت سے امریکہ عالمی دولت کدہ بنا۔ اس طبقے سے اس قدر غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا کہ اب یہ سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ چنانچہ گو ان کے شہری حقوق کی قسم کھائی جاتی ہے لیکن اگر کسی طرف سے معاشی اور معاشرتی ناانصافی کے خلاف احتجاج ہوتا ہے تو فوج تک حرکت میں آ جاتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ سیاہ فام باشندے امریکہ

کی تقسیم اور سیاہ مملکت کے قیام کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔ امریکی معاشرے کو یہ ایک مستقل گہرے خلفشار سے دوچار کرنے کے لئے کافی ہے لیکن یہی ایک مسئلہ نہیں جو خلفشار کا باعث ہے۔ سرمایہ و محنت کی کشمکش کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ متوسط سفید فام طبقات اور نوجوان، بالخصوص طلبہ بھی ہمہ گیر بے چینی کا شکار ہیں۔ درمیانی اور نچلے طبقات کو اب یقین سا ہو گیا ہے کہ صنعتی اور کاروباری سلطنتوں میں ان کا مقام چنداں بلند نہیں ہو سکتا۔ ان کے لئے یہ حقیقی خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اوپر جانے کی بجائے پستی کی طرف گر پڑیں گے۔ وہ اوپر جا سکیں گے یا نہیں، نیچے گرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ معاشرتی ناانصافیوں کو دیکھتے ہیں تو احتجاج کئے بغیر نہیں رہتے۔ ہپّیز اور بیٹلز کی اور کچھ بھی توجیہہ کی جائے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکیگا کہ یہ معاشرتی ظلم کے خلاف ایک دلچسپ اور غیر معمولی احتجاج ہے۔ یہ احتجاج بہر حال مجہول ہے لیکن نوجوان اور طلبہ بپھرتے جا رہے ہیں۔ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں آئے دن مظاہرے اور ہنگامے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی حکومت کا کردار ویت نام میں دیکھتے ہیں تو اس کی مذمت کئے بغیر نہیں رہتے۔ اس احتجاج نے امریکہ کو دنیا بھر میں بدنام کر دیا ہے اور اس کے جنگی منصوبے کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ معاشرے میں ہیجان و اضطراب کا ایک اور شدید عنصر پیدا کر دیا ہے۔

امریکہ کی مشکل یہی نہیں کہ وہ بیمار ذہن اور بیمار جسم ہو گیا ہے، اس کے سامراجی ساتھی اور پیرو بھی اس کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہے۔ ان میں سے بعض تو اسے آنکھیں دکھانے پر اتر آئے ہیں۔ کبھی برطانیہ سب سے بڑی استعماری قوت تھا۔ دوسری استعماری جنگ نے اسے پچھاڑ کے کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ ایک وقت تک اس استعماری شیر کو مردہ متصور نہ کیا گیا لیکن اب حالات کی بے پناہی نے اس کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ شیر کب کا مر چکا ہے۔ رہی سہی کسر وہ ہیجان و اضطراب پوری کر رہا ہے جو امریکہ کی طرح برطانوی معاشرت میں بھی شدید تر ہو چکا ہے۔ برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کا علیحدہ جائزہ لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ سب کے سب امریکہ کی طرح پریشان اور وقف التہاب ہیں۔ وہ امریکہ کے لئے ایک اور درد سر تو ہیں لیکن اس کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ بعض، مثلاً فرانس اندرونی طور پر پریشان ہونے کے باوجود امریکہ کے نکتہ چین بلکہ حریف دکھائی دینے لگے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ امریکہ بالکل تنہا رہ گیا ہے۔ اسے ایک ایسے گوشے سے تقویت پہنچنے لگی ہے جس نے سرمایہ دارانہ نظام کو سب سے پہلے ترک کیا۔ روس نے اشتراکی تجربہ کر کے سرمایہ دارانہ نظام کو بڑی زک پہنچائی۔ لیکن اشتراکی انقلاب لانے کے کوئی پچاس سال بعد وہ ترقی کر کے امریکہ کے ہم پلّہ ہونے لگا تو پتہ چلا کہ اس کے جسد میں روح مارکس اور لینن کی نہیں، ان زاروں کی ہے جن کا تختہ الٹ دیا گیا تھا۔ اب روس امریکہ کا یار استعمار ہے۔ یہ دونوں حریف بہت حد تک حلیف بن چکے ہیں اور بحیرۂ جاپان سے لے کر

بحیرہ متوسط تک ایک دوسرے کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔ یہ ڈرامہ کیا سین دکھلائے گا، اس کا پتہ اُس وقت چلیگا جب زمانہ پردہ اٹھا دے گا۔ لیکن بظاہر امریکہ کی جان میں جان آتی جا رہی ہے اور اسے اپنے نظام سرمایہ داری کے بچ جانے کی آس پیدا ہونے لگی ہے۔

اسے بہرحال خوش خیالی ہی کہا جا سکتا ہے۔ امریکہ کا جو حال ہے اور اس کا جو حشر ہوتا دکھائی دے رہا ہے، اس کا جائزہ اجمالی طور پر لیا جا چکا ہے۔ روس ابھی اس صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوا جس سے امریکہ برسوں سے دوچار ہے لیکن اس کی تعمیر میں خرابی کی جو صورت ہے اسے بھانپنا مشکل نہیں۔ جدید روس ایک اشتراکی ملک کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ پہلے یہ واحد اشتراکی ملک تھا پھر اشتراکی ممالک کا قائد بن گیا۔ اس کے تجربے سے متاثر ہو کر چین جیسا وسیع و عریض ملک اشتراکی ہو گیا۔ چین کے اشتراکی ہونے سے عالمی توازنِ قوّت درہم برہم ہونے لگا اور اشتراکیت کا پلڑا جھکتا دکھائی دینے لگا۔ لیکن روس اور چین کی مناقشت نے روس کو اشتراکیت کا لیڈر نہیں رہنے دیا۔ کون سا ملک اشتراکی ہے اور کون سا نہیں یعنی وہ ممالک اشتراکی ہیں جو رضامندی یا مجبوری سے روس کے ساتھ ہیں یا وہ جو چین کے حامی ہیں یا حامی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا جواب کچھ بھی دیا جائے یہ حقیقت ہے کہ جو اشتراکی دنیا معرضِ وجود میں آ رہی تھی وہ ایک بحران سے دوچار ہو گئی ہے اور روس اس کا لیڈر نہیں کہلا سکتا۔ لیکن روس لیڈر کہلانے پر مصر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو روس کو قیادت سنبھالنے کے لئے اشتراکی بننا پڑے گا یا اشتراکیت کو خیرباد کہہ کے سامراجی بن جانا پڑے گا۔ اس وقت وہ اشتراکیت اور استعمار دونوں کشتیوں میں سوار ہے۔ ایک نہ ایک دن اسے کسی ایک کشتی سے پاؤں اٹھانے ہونگے۔ اس نے اشتراکیت کا راستہ اختیار کر لیا تو امریکہ جس روسی رفاقت پر آج خوش ہو رہا ہے وہ اسے حاصل نہیں رہے گی، اور اگر روس سامراجی بن گیا تو اس کے وقار کو شدید نقصان پہنچے گا اور اس کے اندر لامحالہ وہ خلفشار ابھر آئے گا جس نے امریکہ کو پریشان کر رکھا ہے اور استعمار کا مردِ بیمار بنا دیا ہے۔ یہ روس یعنی سامراجی روس امریکہ کے لئے بوجھ تو بنے گا سہارا ہرگز نہیں بن سکیگا۔ درحقیقت اقبالؒ نے جو کہا تھا۔ گیا دورِ سرمایہ داری گیا ـــــ وہ منظر آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور ہم اس قابل بھی ہیں کہ اس تماشے کو ختم کر دیں اور اس مداری کو کہیں اور حلقہ بندی نہ کرنے دیں۔ جو قومیں آزاد ہو چکی ہیں اور جو آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں ان کے مرضِ کہن کا یہی ایک چارہ ہے۔

ـــــــــــ (بلا) ـــــــــــ